رجسٹر نمبر ایل ۔ ۵۷۳۰

جلد ۵۱ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ ۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپیہ قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۱	بابت مارچ ۱۹۵۹ء	عدد ۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے یوں تو فتوحات کے بے شمار واقعات سامنے آتے ہیں، لیکن شاید ان میں سب سے دلچسپ فتح وہ ہے جو ٹرائے (TROY) کے محاصرے میں اہلِ یونان کو نصیب ہوئی۔ یونانیوں نے ایک مدت دراز تک ٹرائے کے رہنے والوں کو گھیرے رکھا۔ وہ اپنی ساری قوت و طاقت کے ساتھ کئی مرتبہ ان پر حملہ آور ہوئے مگر ٹروجنز (TROJANS) کے عزم و ثبات نے انہیں ہر دفعہ پسپا کر دیا۔ بالآخر یونانی ہمت ہار بیٹھے اور انہوں نے محاصرہ اٹھا لینے کا فیصلہ کیا۔

عین اس وقت جب کہ وہ بے نیلِ مرام واپس لوٹ رہے تھے چند ذہین آدمیوں نے اُن سے کہا: اگر جباری اور قہاری دشمن پر فتح حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اب ہم دل شکستہ ہو کر بیٹھ جائیں۔ بسا اوقات جہاں قہر و جبروت عاجز آ جاتا ہے وہاں چالاکی اور عیاری کام نکال لیتی ہے۔ اس لیے آؤ اب ذرا اس نسخہ کو آزما کر دیکھیں۔ بد دل سپاہ نے جب یہ الفاظ سنے تو اس کی جان میں جان آئی۔ یونانی چالبازوں نے فوراً کاٹھ کا ایک ایسا گھوڑا تیار کیا جو اندر سے کھوکھلا تھا۔ اُس میں بہترین جانبازوں کو چھپا دیا گیا اور باقی فوج قریب کے ویرانوں میں اس طرح منتشر ہو گئی گویا کہ اب وہاں سوائے لکڑی کے گھوڑے کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔

ٹروجنز جب صبح اٹھے تو انہوں نے فرحت و انبساط کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا کہ یونانیوں نے محاصرہ اٹھا لیا ہے اور وہ اپنے وطن واپس جا چکے ہیں۔ اس لیے وہ قلعے کی چار دیواری سے نکل کر اس عجیب و غریب گھوڑے کے گرد جمع ہو گئے اور بالآخر انہوں نے اس بات کا

فیصلہ کیا کہ اس مفید اور "کارآمد چیز" کو قلعہ کے اندر لے جانا چاہیے۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے انہیں اس بات کا قطعاً احساس نہ ہوا کہ جس چیز کو وہ دلچسپ اور اپنے حق میں نفع بخش خیال کر رہے ہیں وہ اُن کے لیے کتنی نقصان دہ اور ہلاکت خیز ہے۔ اُس کے اندر کس قسم کے جارحانہ عزائم انسانی شکل میں چھپے ہوئے ہیں اور وہ اپنی حماقت سے خود بربادی کو کھینچ کر اپنے گھر میں داخل کر رہے ہیں۔

یہ گھوڑا جس وقت قلعہ میں لایا گیا تو اہلِ ٹرائے کے اندر خوشی اور مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بوڑھے، بچے، عورتیں اور مرد اسے آزادی اور حریت کی دیوی سمجھ کر اس کے گرد ناچنے لگے۔ یہ لوگ رنگ رلیوں میں اتنے بدمست ہو گئے تھے کہ انہیں اپنی ہوش تک نہ رہی۔ وہ یونانی، جو گھوڑے کے اندر چھپے بیٹھے تھے، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اس قلعہ کے محافظ اور پاسبان شراب کے نشے میں چور ہیں تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر تلواریں سونت لیں اور بپھرے ہوئے شیروں کی طرح سب سے پہلے ان لوگوں کو قتل کرنا شروع کیا جن کے سپرد قلعہ کی حفاظت اور پاسبانی کا کام تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اس قلعہ کے سارے دروازوں کو چوپٹ کھول دیا۔ یونانی فوج کے وہ دستے جو ارد گرد جنگلوں میں منتشر پڑے تھے وہ اشارہ پاتے ہی جمع ہو گئے اور اُن کی آن میں قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح وہ کام جسے سرانجام دینے کے لیے بڑی سے بڑی قوت بھی کارگر ثابت نہ ہوئی تھی اُسے عیاری اور چالبازی نے ایک لمحہ کے اندر پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

دورِ جدید کا استعمار بالکل اسی طرز پر مختلف ممالک اور اقوام کو سرنگوں کرتا ہے۔ البتہ وہ کاٹھ کا گھوڑا استعمال کرنے کی بجائے تہذیب و شائستگی کی پری کو کام میں لاتا ہے۔ اس "پُراسرار شے" کی ظاہری شکل و صورت اُس گھوڑے سے کہیں زیادہ پُرفریب ہے اور اس کا باطن اُس کی بہ نسبت بہت زیادہ کھوکھلا اور تاریک ہے۔ اس کے پیٹ میں اس قدر گنجائش ہے کہ ہر قسم کی بُرائی، ظلم و تعدی اور جارحیت کو آسانی کے ساتھ چھپایا جا سکتا ہے۔ دنیا کی کمزور اقوام تہذیب کے اس دیوِ استبداد کو جو آزادی

اور حریت کی نیلم پری کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے، بڑے ہی اشتیاق کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر اپنے ممالک میں لے جاتی ہیں۔ مگر جب یہ اژدہا وہاں قدم جما لیتا ہے تو پھر اس کے اندر سے جارحانہ عزائم نکل کر ان استقبال کرنے والی بستیوں کو تاخت وتاراج کر دیتے ہیں۔ ان بدنصیب بستیوں کے بسنے والے کچھ دیر تو استبداد کی یہ ہلاکت خیزیاں کیف ومستی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتے ہیں مگر ایک مدت دراز تک مسلسل چوٹیں کھا لینے کے بعد جب اُن کا نشہ کافور ہو جاتا ہے تو پھر وہ بلبلاتے ہیں۔ لیکن فطرت اس وقت ان کی آہ وفغاں سننے کی بجائے اُن سے بڑے ہی طنزیہ انداز میں کہتی ہے:

این ہمہ آوردۂ تست!

وہ شخص جو معمولی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ مسلمان ممالک پر استعمار کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے اب تیر وتفنگ کی بجائے تہذیب وتمدن کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ استعماریت اب قوت وطاقت کے ساتھ مسلمانوں کو مفتوح نہیں کرتی بلکہ وہ ترقی اور آزادی کی حسین اور دلآویز صورت بنا کر سیم وزر کی جھانجھریں پہنے ان کی طرف لپکتی ہے۔ یہ لوگ بڑے جنون کی سی سادگی کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں سے سہارا دیتے ہوئے اسے اپنی قوم کے اندر لے جاتے ہیں، وہاں اس کے ساتھ بڑی ہی والہانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے اور قوم کا ہر فرد اپنی قیمتی سے قیمتی متاع اس کے قدموں میں بڑی خوشی کے ساتھ لا ڈالتا ہے۔

آپ پچھلے ایک سو سال کے واقعات پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ کیا مغربی استعمار نے تمام مسلم ممالک کے اندر یونانیوں کا سا شرمناک کھیل نہیں کھیلا اور کیا خود ان ممالک کے رہنے والوں نے اہل ٹرائے کی سی حماقت کا مظاہرہ نہیں کیا؟ امت کے جن لوگوں نے استعماریت کی اس یلغار پر مسلمانوں کو متنبہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی باتوں کو رجعت پسندی اور تنگ نظری کہکر رد کر دیا گیا۔ انھیں قوم اور وطن کا دشمن گردانا گیا، انہیں ترقی کی راہ میں ایک سنگ گراں سمجھ کر ہٹانے کی کوشش کی گئی۔ اس تہذیب

جدید نے ان لوگوں کو اتنا بدمست کر رکھا تھا کہ انہیں اس امر کا کبھی احساس تک نہ ہونے پاتا کہ اُن کے تہذیبی قلعے مسمار کیے جا رہے ہیں۔

اب کچھ عرصہ سے جب کہ اُدھر تہذیبِ مغرب کا طلسم کسی حد تک ٹوٹ چکا ہے اور اِدھر مسلمانوں کا نشہ بھی کچھ اُترنے لگا ہے تو ان کے اندر اپنی تباہی کا احساس اُبھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں استعمار کی ریشہ دوانیوں پر کڑھتے ہیں، اور کبھی کبھی ان کی یہ کڑھن جھنجلاہٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس مصیبت سے نکلنے کے لیے وہ جد و جہد بھی کرتے ہیں اور ہر قسم کی قربانیاں بھی دیتے ہیں لیکن اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہو پاتے۔

آج سے چند سال پیشتر جب ان کے اندر اپنی بربادی کا احساس پیدا ہوا تو انہوں نے یہ سمجھا کہ اُن کی یہ بربادی مسلمان ممالک کی غلامی کی وجہ سے ہے چنانچہ انہوں نے ان ممالک کو آزاد کرانے کے لیے نہایت ہی مخلصانہ اور جرأت مندانہ کوششیں کیں اور اس کے نتیجے میں بیشتر ممالک آزاد ہوگئے۔ مگر اس کے فوراً ہی بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ استعمار کی جس غارتگری سے بچنے کے لیے انہوں نے ان ممالک کو غیروں کے چنگل سے آزاد کرایا ہے وہ تو اُن کے اندر اسی طرح موجود ہے اور وہ آزاد ہو کر بھی اس استعمار کی ہوسناکی کی بھینٹ چڑھائے جا رہے ہیں۔ اس صورتِ حال نے مسلمانوں کو بے حد پریشان کر رکھا ہے مگر وہ کچھ سوچ نہیں پاتے کہ آخر وہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کریں۔ پریشانی کے اسی عالم میں کبھی وہ صنعتی اور مادی ترقی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور کبھی دنیا کے مختلف سیاسی بلاکوں کی طرف دادرسی کے لیے لپکتے ہیں مگر اُن کا اصل مقصد حل نہیں ہو پاتا، اور اُن کی مصیبت جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ یہ چیز ہر مسلمان کے لیے سخت وجہِ اضطراب ہے اور اس لیے دنیا کا ہر حساس دل کسی نہ کسی انداز سے اس پر ضرور غور کرتا ہے۔ ہم بھی ان صفحات میں آج انشاء اللہ اسی موضوع پر چند گزارشات پیش کریں گے اور اُن تدابیر کی نشاندہی کریں گے جن پر

عمل پیرا ہو کر امتِ مسلمہ مغربی استعمار کی آفت سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔

کسی مرض کا علاج اُس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ مریض کے ماحول کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے۔ اس لیے مسلمانوں کے مرض کی تشخیص کرنے اور اُس کا علاج تجویز کرنے سے پیشتر سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اُن حالات کا جائزہ لیں جن میں مسلمان اور دنیا کی دوسری اقوام زندگی بسر کر رہی ہیں۔

پہلی چیز جو مسلمانوں کے ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ زمان و مکان پر انسان کی فتح نے پوری دنیا کو ایک وحدت بنا دیا ہے۔ انسان اب حالات کے ہاتھوں اس بات پر مجبور ہو گیا ہے کہ وہ وطن و نسل کی تنگ دامانیوں سے نکل کر سیاست و معیشت کی وسیع تر وحدتوں کو اپنی تعمیر نو کی اساس بنائے اس لیے دنیا کی جو قوم بھی اب خاکِ وطن کو اپنی پناہ گاہ بناتی ہے وہ زمانے کی دستبرد سے اپنے آپ کو زیادہ دیر تک بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی لہٰذا مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اب قومی، وطنی، نسلی یا لسانی حصار انہیں مغربی یلغار سے کبھی نہیں بچا سکتے۔ اب ایک قوم دوسری قوم سے نہیں ٹکراتی، ایک نسل دوسری کے خلاف صف آرا نہیں ہوتی بلکہ ایک تہذیب دوسری سے نبرد آزما ہوتی ہے اور ایک تمدن دوسرے کے درپے آزار ہوتا ہے۔ آج کشمکش قوموں اور نسلوں کی تنگ حدود سے نکل کر افکار و نظریات کے وسیع میدانوں میں برپا ہے اور اقوام و ملل کی قسمت کے فیصلے اب انہی بنیادوں پر ہوتے ہیں۔

پھر ہمیں اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ مغرب مادی ترقی کی دوڑ میں اب اتنا آگے نکل گیا ہے کہ مسلمان اس میدان میں کبھی بھی اُسے نیچا نہیں دکھا سکتے۔ ہم یہ اس لیے نہیں کہہ رہے کہ مسلمان دل شکستہ ہوں، بلکہ ہم یہ گزارش صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ حقیقتِ حال سے صرفِ نظر نہ کریں اور حقائق کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ مسلمان اگر دنیا میں اخلاقی طاقت بننے کی بجائے محض مادی قوت بننے کی سعی کریں گے تو ان کی حیثیت ہمیشہ ایک محتاج اور دست نگر قوم کی سی ہو گی جس کو مغربی استعمار بے زبان گلہ کی

طرح جس طرف چاہیگا بالکل میکانکی طور پر ہانکتا ہوا لے جائیگا لیکن اگر وہ اس کے برعکس اخلاق کے بل بوتے پر دنیا میں جینا سیکھیں گے تو پھر وہ نہ صرف خود اس کرۂ ارضی پر ایک رہنما قوت ثابت ہونگے بلکہ اُن کی مقناطیسی کشش جان کے دشمنوں اور خون کے پیاسوں میں سے بھی مخلص رفیق اور دلسوز فدائی تلاش کریگی۔ اخلاق انسانوں کو آپس میں جوڑتا ہے اور دنیا پرستی انہیں ایک دوسرے کا دشمن بناتی ہے۔ مسلمانوں کا وہ کونسا خطہ ہے جس میں دین و اخلاق کو چھوڑ کر صنعتی اور مادی ترقی کے لیے سر توڑ کوششیں نہیں کی گئیں لیکن اُن کا جو کچھ حشر ہوا ہے وہ بھی کسی دیدہ ور سے پوشیدہ نہیں۔ دنیاوی فوائد و لذائذ کے جنون نے اُن کے اندر نہ صرف دشمنی اور رقابت کی آگ بھڑکائی ہے بلکہ انہیں مغرب کا بے دام غلام بھی بنا دیا ہے۔ اس صورتِ حال کو جانتے ہوئے یہ عین حماقت ہوگی اگر ہم اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو محض مادی اسباب و وسائل جمع کرنے میں صرف کرتے رہیں۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی قسمت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے یہ امر پوری طرح ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ ان کا تصورِ دین دوسری اقوام کے تصورِ مذہب سے بالکل الگ اور جداگانہ ہے۔ اس لیے دین اور اس کی روایات کے ساتھ ان کی وابستگی کی نوعیت بھی دوسری اقوام سے یکسر مختلف ہے۔ ان کے ہاں دین خدا اور بندے کے درمیان کوئی پرائیویٹ رابطہ نہیں بلکہ یہ اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مبدأ اور اساس ہے۔ یہ اگر ایک طرف ان کے فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامتی، اخلاق میں مضبوطی اور روح میں لطافت پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اُن کی معاشرت میں حُسنِ سلوک، تہذیب میں فضیلت، تمدن میں توازن اور معیشت میں عدل و مواسات کا ضامن بھی ہے۔ اس سے مسلمان نہ صرف اپنے قلب کے اندر سوز و گداز پیدا کرتے ہیں بلکہ اسی کی قوت سے وہ دنیا میں سربلند اور سرفراز ہوتے ہیں۔ یہ دین ان کا ایک ایسا مضبوط ترین حصار ہے جو اُن کی شیطنت کے ہر حملے سے خواہ وہ فکر و نظر کا ہو یا لشکر و سپاہ کا، پوری طرح حفاظت کرتا ہے اس لیے اس دین کو جو اُن کی ساری زندگی پر حاوی ہے، ترک کر دینا کوئی سہل اور آسان کام نہیں۔

قریب قریب یہی تعلق مسلمانوں کا اپنی روایات سے بھی ہے۔ مسلمانوں کا ماضی بڑا درخشاں اور

تابندہ ہے اور اس اعتبار سے وہ اس دورِ سعید کو جس میں حضور سرورِ کائنات اور آپ کے جلیل القدر رفقاء کار نے اپنی پاکیزہ زندگیاں گزاریں ہمیشہ ایک آئیڈیل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اسی دور کے ساتھ ان کا تعلق بڑا گہرا اور پائیدار ہے۔ انہیں روایات نے مسلمانوں کو اپنی آغوش میں پالا ہے، انہیں کی وجہ سے یہ قوم بغیر کسی خارجی سہارے کے آج تک زندہ چلی آتی ہے، انہیں کے دم قدم سے اس کے اندر زندگی کی حرارت اور کچھ کرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ ان روایات کے نقوش ہیں اس کے شعور کی خارجی سطح پر ہی جگمگاتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ وہ یہیں اس قوم کے جذبات و احساسات کی گہرائیوں میں بھی جھلملاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جس چیز نے انسان کے فکر سے لیکر اس کے قلب تک کو مسخر کر رکھا ہو اور جو حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہو اس کی گرفت کو آسانی کے ساتھ کمزور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام صرف اسی صورت میں سرانجام پا سکتا ہے جب خود قوم کو صفحۂ ہستی سے معدوم کر دینے کا ناپاک عزم کر لیا جائے۔

امتِ مسلمہ بلاشبہ اس وقت انحطاط کا شکار ہے لیکن ہم اسے اتنا بیوقوف نہیں سمجھتے کہ وہ مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہو کر دین اور دینی روایات کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جائے گی اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مٹانے کا سامان فراہم کرے گی۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت اسلام پر نہایت پختہ ایمان رکھتی ہے۔ البتہ غیر ملکی سامراج کی جباری اور عیاری نے اور اس کے اپنے گھر کے دانا دشمنوں اور نادان دوستوں نے اسے قوت و استحکام کے ان لازوال خزانوں سے محروم کر رکھا ہے جو اسلام کے ذریعہ اسے ماضی میں حاصل ہوتے رہے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہم غیروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اسی کی طرف توجہ دیں اور زبانی اشتغال پر قناعت کرنے کی بجائے بالفعل اس سے فائدہ اٹھائیں۔

اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہم دین کے معاملے میں اب بالکل یکسو ہو جائیں۔ ہماری اسی یکسوئی پر ہی ہمارے مستقبل کا سارا دارومدار ہے۔ دنیا میں وہ شخص یا قوم کبھی کامیاب و کامران نہیں ہوتی جو

اپنے نصب العین کے معاملے میں مخلص نہ ہو کسی ملت کے لیے سب سے زیادہ افسوسناک صورتِ حال یہ ہے کہ اُس کے قول و عمل کے دو جُدا جُدا رنگ ہوں اور اس کے اقوال سے جو امیدیں بندھتی ہوں خود اس کے عمل سے ٹوٹ جائیں۔ اجتماعی زندگی میں یہ عجیب و غریب نقطہ یاد رکھنے کا ہے کہ نقشۂ زندگی پر جتنی تہذیبیں اُبھریں اور جتنی قومیں کارزارِ حیات میں کامیاب ہوئیں اور پروان چڑھیں وہ سب وہی تھیں جنہوں نے اپنے تصورات کو زندہ رکھنے کے لیے ایثار سے کام لیا۔ پھر جو تہذیبیں مٹیں اور جن جن قوموں نے موت و ہلاکت کی آواز پر لبیک کہا وہ سب کی سب وہ تھیں جن میں اپنے دین و ایمان پر مٹنے کا جذبہ ختم ہوگیا اور انہوں نے مصلحت پسندی اور خود غرضی پر اپنے سیاسی تصورات کو قربان کر دیا۔ اس نصب العین کی عملی حیثیت کیا رہ جاتی ہے جس سے ہم معمولی سے معمولی لالچ کے تحت انحراف کرنے پر تیار ہو جائیں۔ وہ شخص جو کسی قوم کو یہ سبق دیتا ہے کہ تم ایک دنیاوی منفعت کی خاطر دین کے احکام کو پس پشت ڈال دو یا دوسرے لفظوں میں فرض پر مصلحت کو مقدم رکھو وہ یا تو اس قوم کا بدخواہ ہے یا اگر خیر خواہ ہے تو اتنا سادہ ہے کہ اُس کی سادگی کے ڈانڈے بے وقوفی سے جا ملتے ہیں۔ آخر وہ فرض ہی کیا ہے جس کی بجا آوری مصلحتوں کی قربانی کی طالب نہ ہو۔ فرائض کی کشت تو ذاتی آرزوؤں اور تمناؤں کے خون سے ہی سیراب ہوتی ہے۔

یہ اصول کوئی ایسا نہیں جو صرف اسلام کے ساتھ مخصوص ہو۔ اس اصول کی کارفرمائی ہم حق و باطل دونوں میں دیکھتے ہیں۔ مغرب کی ترقی کا راز اگرچہ وہ سراسر باطل ہے، اسی اصول میں مضمر ہے۔ اہلِ مغرب نے جب وطن کو اپنا ایمان ٹھہرایا تو سب کچھ اسی کی خاطر قربان کر دیا اور اب جبکہ انھوں نے سیاسی اور معاشی وحدتوں کو اپنی زندگی کی اساس قرار دیا ہے تو وہ اس راہ میں سب کچھ لٹا رہے ہیں اپنے نصب العین کو خادم بنا کر اور اپنی مصلحتوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر دنیا میں نہ آج سے پہلے کسی کو کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ کسی ہوش و خرد رکھنے والے انسان کو اس کی توقع رکھنی چاہیے۔ اس لیے ہم دین کے معاملے میں جس قدر جلد یکسو ہو جائیں اتنا ہی یہ ہمارے حق میں مفید اور بہتر ہے۔

اس امر کا حتمی اور قطعی فیصلہ کر لینے کے بعد کہ دین ہی ہمارا مدارِ اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہے اور ہمارے مستقبل کا انحصار اسی پر موقوف ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم دین کے حدود سے پوری طرح آشنا ہوں۔ وہ قوم اپنے ملک کی حفاظت کبھی نہیں کر سکتی جسے اس بات کا علم نہ ہو کہ اس کے وطن کی حدود کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اور دشمن کی سرحد کس مقام سے شروع ہوتی ہے۔ اسلام اور جاہلیت کے درمیان تفریق کے جو خطوط ہیں جب تک وہ روشن نہیں ہوتے اس وقت تک ہم اسلام کو بطور نظامِ حیات کبھی نہیں اپنا سکتے۔ ان حدود کے متعین ہو جانے کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم پھر پوری قوت طاقت سے ان کی مدافعت کریں تاکہ کوئی چور اور ڈاکو ان کے اندر گھسنے نہ پائے۔

مغربی استعمار کی یوں تو اسلام کے خلاف ساری سازشیں ہی انتہائی افسوسناک ہیں لیکن ان میں غالباً سب سے زیادہ شرمناک سازش وہ ہے جو اس نے ہمارے دین کی سرحدوں کو توڑنے کے لیے کی ہے۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ اگر ہماری سرحدی چوکیاں مسمار کر دی جائیں تو ہمیں بڑی آسانی کے ساتھ تاخت و تاراج کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جس دن سے وہ ہمارے تہذیبی قلعہ کی بیرونی دیواروں میں شگاف کرنے میں کامیاب ہوا ہے اسی وقت سے اسلام کے قلب و جگر پر تابڑ توڑ حملے کیے جا رہے ہیں اور حالت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اب ہر پاگل اور سر پھرا اٹھتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اسلام اور ملتِ اسلام پر شبخون مار رہا ہے۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے ان سرحدوں کی حفاظت اور پاسبانی کا انتظام کرنا ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے گھر کے اندرونی حالات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ کی پہلی کوشش یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے اپنی انفرادی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں —— ہمارے دل و دماغ پر استعمار نے جو اثرات مرتب کیے ہیں اُن کو ہم بالکل مٹا دیں اور اُس رنگ میں پوری طرح رنگ جائیں جس میں ہمیں اسلام دیکھنا چاہتا ہے۔

قلب و نگاہ کو مسلمان بنانا کوئی ایسا آسان کام نہیں جو آن کی آن میں پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔ اس کے لیے بڑی ریاضت اور مشقت درکار ہے۔ اس لیے کہ آدمی کو اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون کرنا پڑتا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ بسا اوقات آدمی جان تک کی قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر اپنی کسی خواہش کو قربان کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔

وہ دور جس میں سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں اس اعتبار سے بڑا ہی سخت اور آزمائش کا دور ہے۔ غیر اسلامی افکار و تصورات نے ہماری زندگی کا پوری طرح احاطہ کر رکھا ہے۔ پھر ان جاہلی نظریات کی اساس پر ایک ایسا ہمہ گیر نظام ہم پر مسلط ہے جس کی گرفت سے ہماری زندگی کا کوئی گوشہ آزاد نہیں۔ ان حالات میں خدا کے دین پر عمل کرنا معاشرت، معیشت اور سیاست کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جس کے محاذوں کا کوئی شمار نہیں اور جس کے آلات کا کوئی شخص بھی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اپنے نفس کے خلاف یہ بزم آرائی خواہ کتنی ہی مشکل اور دشوار ہو مگر اسلام کے قیام کے لیے یہ ایک ناگزیر منزل ہے۔ جب تک ہم اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو نفس کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں نہیں دے دیتے اس وقت تک استعمار مسلمانوں میں سے بڑی آسانی کے ساتھ اپنے ایجنٹ اور کارندے تلاش کرنے میں کامیاب ہوتا رہے گا۔ لیکن جس وقت اس نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کے قلب و نگاہ کو اب سوائے اسلام کے اور کوئی چیز مفتوح نہیں کر سکتی اسی وقت اُس کی کمر ٹوٹ جائے گی اور اُس کے حوصلے شکستہ ہو جائیں گے۔

نفس کے ساتھ اس جنگ کو کامیاب بنانے کے لیے جو خارجی محرکات کام کرتے ہیں ان میں بھی ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ہم اس نظریہ کو تو تسلیم نہیں کرتے کہ انسان کا خارجی ماحول ہی اس کے افکار و تصورات کی صورت گری کرتا ہے اور ہمارے نظریات ہمارے ماحول کے رُخ زیبا کا عکس ہیں لیکن اس بات کے ضرور قائل ہیں کہ سیرت و کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کے لیے انسان کا ماحول کافی حد تک انسان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر زندگی کے اجتماعی ڈھانچے بدل جائیں

تو پھر انفرادی زندگی کو اُس کے مطابق بدل دینا کافی حد تک سہل اور آسان بن جاتا ہے۔ معاشرے کی قوت ایک بہت بڑی قوت ہے اور انسان کے انفرادی رجحانات کے پیدا کرنے اور احساسات کو پالنے میں اس کا بہت زیادہ دخل ہے۔ جس قوم یا ملک میں انفرادی نظریات اور اجتماعی افکار برسرِ پیکار ہوں وہ قوم یا ملک کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ ہمارے اجتماعی تخیلات اور انفرادی احساسات میں جو کشمکش عرصۂ دراز سے جاری ہے اُس سے استعمار آج تک ہر قسم کا ناجائز فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔ بلکہ اگر کہا جائے کہ مسلمانوں کے اندر استعمار کی آبیاری اسی فکری اور عملی خلفشار نے کی ہے تو یہ چیز زیادہ صحیح ہوگی۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے اس کشمکش کو ہر قیمت پر ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی عملی صورت صرف یہی ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے نظامِ اجتماعی کے سارے شعبوں کو یعنی سیاست، معیشت اور معاشرت کو غیر اسلامی اجزاء سے یکسر پاک کر کے انہیں از سر نو اسلام کی تحویل میں دے دیں۔ ہم جس حد تک غیر اسلامی اثرات کو زائل کرنے میں کامیاب ہونگے بالکل اسی تناسب سے استعمار پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا چلا جائیگا۔

تعمیرِ نو کے اس کام میں یہ امر اشد ضروری ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے دین اور اُس کی روایات کے پابند ہوں۔ ہماری ریاستیں اسلامی احکام کے نفاذ کا ذریعہ بنیں، ہماری معیشت اسلام کے عدل و انصاف کا مظہر ہو اور ہماری معاشرت، انسانی اخوت اور محبت کا ایک زندہ نمونہ پیش کرے۔ انفرادی زندگی کی جزئیات سے لے کر اجتماعی زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل تک سب میں اسلام ہی ہماری رہنما قوت ہو۔ ہماری زندگی کے کسی گوشے میں اور ہمارے قلب و دماغ کے کسی ریشے میں جاہلیت، نفوذ نہ کرنے پائے۔ اس معاملے میں ہم جس قدر زیادہ احتیاط کا ثبوت دیں گے اسی قدر ہماری ملت قوت و طاقت فراہم کرے گی اور ہمارے عزائم کو کامیاب بنانے میں کامیاب ہوگی۔

جس قوم کی قومیت دین اور دینی روایات سے تشکیل پائے اُس کے لیے یہ طرزِ عمل اختیار کرنا

بالکل فطری اور ناگزیر ہے۔ قوموں کو ہمیشہ دو قسم کے محرکات وجود بخشتے ہیں۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ مثبت داعیات انسانوں کے کسی گروہ کے اندر وحدتِ فکر اور اشتراکِ عمل پیدا کر کے اُس کے مختلف اجزاء کو آپس میں جوڑتے اور اُن کے درمیان رابطہ اور ضابطہ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن قومیت کے صحیح نشو و نما کے لیے صرف یہی ایجابی محرکات کافی نہیں ہوتے بلکہ اس مقصد کے لیے ایسے جذبات بھی درکار ہیں جو ایک قوم کو اپنی علیحدگی کا شعور بخشیں۔ اُس کے اندر اس احساس کو بیدار کریں کہ اُس کا اپنا ایک مستقل وجود ہے جو اُسے دوسروں سے ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔

دنیا کی دوسری اقوام نے ان محرکات کو نسل، زبان، رنگ اور وطن میں فراہم کیا ہے اور اب کچھ عرصہ سے وہ انہیں سیاسی اور معاشی وحدتوں میں تلاش کر رہی ہیں۔ لیکن ان کے برعکس ملتِ بیضا ہمیشہ سے اپنے وجود کے لیے دین اور اس کی روایات کی رہینِ منت رہی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو شخص ہمارے دین کے اندر رخنے پیدا کرتا ہے وہ درحقیقت ہماری قومیت پر ضربِ کاری لگاتا ہے۔ اور اس طرح وہ افراد یا گروہ جو اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ جاہلیت کا پیوند لگاتے ہیں اُن کی نیتیں اور ارادے خواہ کتنے ہی پاکیزہ اور مقدس ہوں مگر وہ اپنی سادگی یا حماقت سے استعمار کے گھوڑے کو اپنی قومیت کے قلعے کے اندر داخل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

بیجا نہ ہوگا اگر ہم یہاں ایک اُس اعتراض کا بھی جواب دے دیں جو ہمارے اس طرزِ فکر پر بسا اوقات کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے متجدد دین جو اسلام اور کفر کے درمیان رشتہ اتحاد پیدا کرنے کے لیے بڑی شدت سے آرزومند ہیں یہ کہتے ہیں کہ تم اسلام کے دائرہ کو خواہ مخواہ تنگ کر رہے ہو۔ اسلام کا مزاج امتزاجی ہے اور اُس میں ہر وقت اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ وہ غیروں سے اخذ و جذب کرتا رہے۔

یہ بات بظاہر بڑی دل لگتی ہے اور تاریخ کے بعض واقعات بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اگر ہم ذرا گہرائی میں اُتر کر اصل صورتِ حال کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اخذ و تہذیب کا وہ عمل جس کی نظیر ہمیں اپنے اسلاف کے ہاں ملتی ہے وہ آج سے بالکل مختلف ہے۔ اُس وقت امتِ مسلمہ ایک زندہ اور متحرک قوت تھی۔ اس کے اندر اتنی توانائی اور حرارت تھی کہ وہ ہر چیز کو بڑی آسانی کے ساتھ اپنے سانچے میں ڈھال لیتی۔ لیکن آج حالات یکسر مختلف ہیں۔ اس دور میں مسلمان ہر جگہ مغلوب و مفتوح ہیں۔ تہذیبِ مغرب وقت کی غالب اور حکمران تہذیب ہے اور اس نے نوعِ انسانی کی نظروں کو خیرہ کر رکھا ہے۔ اس لیے اب اگر کوئی شخص اسلام کے اندر کفر و الحاد کے کسی جزو یا اجزا کو شامل کرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے تہذیبی قلعے میں اُس استعمار کو گھسنے کا موقع دیتا ہے جس کو اسلام اور اس کی مضبوط روایات نے ابھی تک داخل ہونے سے روک رکھا تھا۔

افراد کے درمیان بلاشبہ کسر و انکسار کے ذریعہ مصالحت کی کئی صورتیں نکالی جا سکتی ہیں لیکن یہ عمل افکار و نظریات کے درمیان کبھی بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ جب بھی دو مختلف تہذیبوں کے اجزائے ترکیبی کو باہم جوڑ کر ایک نئی تہذیب کو جنم دینے کی کوشش کی گئی جس میں دونوں کے صالح عناصر ایک خاص تناسب سے جمع کرنا مقصود تھا تو اہلِ دنیا کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ غالب تہذیب کے اجزا نے فوراً آگے بڑھ کر اپنی قوت اور طاقت کے ذریعہ کمزور اجزا پر اس طرح سے اپنا عمل شروع کیا کہ یہ اجزا اپنی حقیقی قدر و قیمت بالکل کھو بیٹھے اور اپنے آپ کو بالکلیہ طاقتور عناصر میں مدغم کر دیا۔

ہمارے ہاں اسلام اور تہذیبِ مغرب کے درمیان مصالحت کی جس قدر کوششیں کی جا رہی ہیں اُن کا تجزیہ کیجیے اور دیکھیے کہ یہ مصالحت اُس اخذ و تہذیب سے کس حد تک مختلف ہے جس کی مثال ہمیں ماضی میں ملتی ہے۔ وہاں جب بھی کسی تہذیب میں کچھ صالح اجزا ایسے نظر آئے جو اسلامی

تمدن میں کھپائے جانے کی صلاحیت رکھتے تھے تو انہیں پہلے تمام غیر اسلامی آلائشوں سے بالکل پاک اور منزہ کیا گیا اور پھر انہیں اس طرز پر ڈھالا گیا کہ وہ اسلامی تہذیب کا ہی ایک حصہ بن کر رہ گئے۔

اس کے برعکس آج اسلام اور تہذیب مغرب میں مصالحت کرانے کے لیے دین حق میں اس انداز سے تحریف کی جا رہی ہے جس سے اس کی الگ حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ دین تہذیب مغرب کا ہی ایک منہ بولا بیٹا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہمیں دورِ حاضر میں مغربی افکار و نظریات کو اپنانے میں انتہائی درجہ کا حزم و احتیاط درکار ہے۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ امتِ مسلمہ کو مغربی تہذیب کے اُن اجزاء کو بھی جو بظاہر بالکل بے ضرر بلکہ کسی حد تک نفع رساں معلوم ہوتے ہیں قبول کرنے میں خاصا تأمل کرنا چاہیے۔ مغربی تہذیب، مادی فلسفۂ حیات کی ہی شارح اور ترجمان ہے۔ اس میں نشست و برخاست اور اکل و شرب کے طور طریقوں سے لیکر زندگی کے اہم سے اہم معاملات تک سب میں مادیت پوری طرح کارفرما ہے اس لیے ہمیں اپنے آپ کو اس تہذیب کے اثرات سے ممکن حد تک بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ ہماری ملت کا استحکام بہت حد تک ہمارے اس طرزِ عمل سے وابستہ ہے۔

یہ تو ہیں وہ تدابیر جن پر عمل پیرا ہو کر ہم امتِ مسلمہ کو داخلی طور پر مستحکم بنا سکتے ہیں تاکہ وہ استعمار کے ہر چیلنج کا کامیابی کے ساتھ جواب دے سکے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے گھر کے باہر بھی کچھ اس قسم کے انتظامات کرنے چاہییں جو بالواسطہ ملتِ بیضا کی قوت و طاقت کا ذریعہ بنیں۔

اس ضمن میں ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم استعمار کی اُن غلط فہمیوں کا پردہ چاک کریں جو اُس نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کی غرض سے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا رکھی ہیں۔

پھر ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مغربی تہذیب اور تمدن کا اچھی طرح تجزیہ کر کے

اس کے نقائص اور عیوب کو لوگوں پر آشکار اکریں تاکہ اس کا طلسم ٹوٹے اور لوگ کسی ذہنی مرعوبیت کے بغیر اس کا مطالعہ کریں۔

اس کے علاوہ ہمیں اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اس دور کی بھولی بھٹکی انسانیت کو راہ ہدایت دکھائیں۔ اور اگر بالفرض ہم پوری نوع انسانی کو صحیح راستے پر ڈالنے میں کامیاب نہ بھی ہوں تو کم ازکم اُن سعید روحوں تک تو اسلام کا پیغام بالضرور پہنچادیں جو حق کی تلاش میں نہ معلوم کتنی مدت سے سرگرداں ہیں۔ اور محض بے خبری کے عالم میں اسلام اور دنیائے اسلام کی دشمن بنی ہوئی ہیں

سخت نامناسب ہوگا کہ ہم بات ختم کرنے سے پیشتر اسلام کی ایک بنیادی حقیقت کی صراحت نہ کردیں۔ اسلام بلاشبہ قوت وطاقت کا سرچشمہ ہے۔ یہ امت مسلمہ کو داخلی انتشار اور خارجی یورشوں سے پوری طرح محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور نہ صرف محفوظ رکھ سکتا ہے۔ بلکہ اسے ہر قسم کی سربلندی اور سرفرازی بھی عطا کر سکتا ہے۔ اس کے دامن میں پناہ لینے سے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں اور اربوں برکات حاصل ہوتی ہیں مگر ان کے حصول کا سارا انحصار اس بات پر موقوف ہے کہ ہم اسلام کو کسی دنیاوی غرض کے لیے نہ اپنائیں بلکہ اس کے ساتھ ہمارا تعلق خالصتہً للہ کے لیے ہو۔ یہ فوائد جن کا ذکر ہم نے گذشتہ صفحات میں کیا ہے اسلام سے وابستگی کے محض ضمنی فائدے ہیں اور یہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب دین حق کے ساتھ ہم محض اپنے خالق اور مالک کی رضا جوئی کے لیے تعلق قائم کریں۔ یہ دین بلاشبہ ہماری اس دنیاوی زندگی کو بھی بہتر بناتا ہے لیکن اس کی اصل غرض نوع انسانی کو آخرت میں فائز المرام کرنا ہے۔ اس مرد حق آگاہ نے کس خوبی سے آخرت اور دنیا کے تعلق کو واضح کیا جب اُس نے امت مسلمہ کو مخاطب ہو کر کہا:

"اے غافل انسانو! کیا ابھی تک تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے، آخرت اور دنیا کی حیثیت پرندے اور سائے کی سی ہے۔ اگر تم پرندے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تو سایہ خود بخود تمہارے قبضے میں آجائیگا لیکن اگر تم پرندے کو چھوڑ کر محض سائے کے پیچھے پڑے رہے تو نہ تمہارے ہاتھ سایہ ہی آسکے گا اور نہ پرندہ۔"

محسنِ انسانیتؐ

از

جناب ابو السلام نعیم صدیقی صاحب

[مندرجہ ذیل مقالہ دراصل برادر محترم جناب نعیم صدیقی صاحب کی زیر ترتیب کتاب "محسنِ انسانیت" کے مقدمے کا ایک حصہ ہے۔ اس میں انہوں نے سیرت نبوی کے مطالعہ کے لیے ایک صحیح نقطۂ نظر کی نشان دہی کی ہے۔ خدا کرے کہ فاضل مصنف کو فرصت و اطمینان کے لمحات میسر ہوں اور وہ اپنی اس بیش قیمت تصنیف کو جس کے لیے نہ جانے کتنی آنکھیں منتظر اور کتنے دل بیتاب ہیں، جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں ۔ ع - ح ص]

بدقسمتی سے سیرت نبویؐ کا مطالعہ ہمارے ہاں اس اسپرٹ اور اس نقطۂ نظر سے کم ہو رہا ہے جس سے ہونا چاہیے۔ ہماری دلچسپی اس میدان میں پوری طرح یہ نہیں رہی کہ ہمیں وہاں سے ایک نقشہ زندگی حاصل کر کے اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھالنا ہے، بلکہ بعض دوسری دلچسپیاں بیچ میں آگئی ہیں اور روز بروز بڑھ رہی ہیں۔

بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ساری دلچسپی مجرد حصولِ ثواب کے لیے کرتے ہیں (اس سے انکار نہیں کہ حضورؐ سے قرب کی ہر کوشش خدا کی بارگاہ میں پسندیدہ ہے اور اس پر اجر کی توقع رکھنی چاہیے۔ لیکن ایسی کوشش کا اوّلین مدعا زندگی کو سنوارنا بھی تو ہو)۔ دھوم دھام سے میلاد کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں اور اس اعتقاد سے کی جاتی ہیں کہ ان مجالس میں حضورؐ کی روح پرنور جلوہ گر ہوتی ہے اور اپنے پیروؤں کی عقیدت کے مظاہر کو دیکھ دیکھ کر خوشنود ہوتی ہے۔ شیرینی کے طشت، پھولوں کے گجرے اور ہار، قوالی اور نعت خوانی

کے اہتمام، اگر بتیوں اور لوبان کی خوشبوؤں کے مرغولے، قمقموں اور فانوس کی لمعہ پاشیاں، یہ سب کچھ اسی اعتقاد کے ترجمان ہیں۔ سیرتِ نبویؐ سے اس انداز کی عقیدت جو نقشہ سامنے لاتی ہے وہ کسی انسان کا نقشہ نہیں، گوشت پوست سے بنے ہوئے کسی آدم زاد کی شخصیت نہیں بلکہ ہم ایک فوق الانسان ہستی سے متعارف ہوتے ہیں جس کا پیکر نور سے ڈھلا ہے، جس کے جسم کا سایہ نہیں، جس کے کارنامے میں سارا پارٹ معجزوں کا ہے، جو عالمِ اسباب کے قوانین سے بالاتر ہے، جس کے سارے کام فرشتے سرانجام دیتے ہیں اور جس کی ہر بات اور ہر چیز پُراسرار ہے۔ انکار نہیں کہ ابنائے نوع کے مقابلہ میں حضورؐ کا روحانی و اخلاقی پایہ بدرجہا بلند ہے، وہاں بہت سی فوق العادہ چیزیں بھی ملتی ہیں، وہاں معجزے بھی ہیں اور وہاں فرشتے بھی حرکت کرتے نظر آتے ہیں ــــ مگر بہرحال وہ پاک زندگی ایک انسان کی زندگی ہے اور اس کی عظمت کی اساس ہی یہ ہے کہ ایسی لامثال زندگی ایک انسان نے پیش کی۔ وہاں قوانینِ فطرت اور نوامیسِ تاریخ و مدنیت ہی کے دائرے میں سارا کام ہوتا ہے اور کامیابی کی راہ کے ایک ایک چپے پر قربانیاں پیش کی جاتی ہیں وہ ایک انسان کی زندگی ہو کر ہی ہمارے لیے اسوہ بنتی ہے اور اسی تصور کے ساتھ ہم اس سے اکتساب کر سکتے ہیں، اس سے عزم و ہمت کا درس لے سکتے ہیں، اس سے اصول کی پابندی اور فرض شناسی کا سبق سیکھ سکتے ہیں، اس سے انسانیت کی خدمت کا جذبہ اخذ کر سکتے ہیں اور اس سے بدی کی طاقتوں کے خلاف معرکہ آرا ہونے کے لیے ایک تڑپ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔ سیرتِ نبویؐ کو اگر تم معجزہ بنا دو گے اور اگر اسے فوق الانسانی کارنامے کا رنگ دے دو گے تو پھر مٹی کے بنے ہوئے انسانوں کے لیے اس میں نمونہ کیا رہے گا۔ ایسی ہستی کے سامنے ہم مرعوب اور حیرت زدہ تو ہو سکتے ہیں اس کا کوئی پرتو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے۔ اس سے ہم عقیدت تو رکھ سکتے ہیں، اس کا اتباع نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جہاں جہاں عقیدت مندی کا یہ خاص رنگ پہنچا ہے وہاں جتنا جتنا یہ گہرا ہوتا جاتا ہے، عملی زندگیاں اتباعِ نبوت سے اتنی ہی آزاد ہوتی جاتی ہیں۔ بلکہ الٹا حالت یہ ہے کہ گھناؤنے معاشی و معاشرتی

جرائم کے میکدے ہیں جو لوگ خم کے خم لنڈھاتے ہیں وہ اس سستے طرز سے مظاہرہ عقیدت کر کے اپنے مضطرب ضمیر کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ؎

"کچھ بھی ہیں، لیکن تیرے محبوب کی امت میں ہیں"

دوسری طرف مغرب سے ایک دوسرا رجحان آگھسا ہے، جسے اعاظم پرستی (HERO WORSHIP) کہا جاتا ہے۔ یہ رجحان اپنی اصل روح کے اعتبار سے قوم پرستانہ جذبات کا ترجمان ہے۔ ایک طرح کا قومی تفاخر ہے جو دوسروں کے سامنے ماضی کی نمایاں شخصیتوں کا مظاہرہ کراتا ہے۔ یہ رجحان گویا یہ کہتا ہے کہ دیکھو ہمارے پاس ایسی اور ایسی ہستیاں ہیں، ہماری تاریخ میں اتنے اتنے بڑے پائے کے بزرگ ہو گزرے ہیں اور ان کے یہ یہ یادگار کارنامے ہیں جن کے ہم وارث ٹھہرے ہیں اور جو ہمارے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ اس رجحان کی علامت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس کے تحت ہر قوم متعدد شخصیتوں کے ایامِ وفات، ایامِ پیدائش اور دوسرے یادگاری دن بڑے ٹھاٹھ سے مناتی ہے۔ مگر یہ ایام کہیں بھی ان شخصیتوں سے استفادہ کا ذریعہ نہیں بنتے۔ انسانیت کے جن نمونوں کو بصد تفاخر دوسروں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ان کا کوئی پرتو پیش کرنے والوں کی اپنی زندگیوں میں دکھائی نہیں دیتا اور نہ کبھی اس پرتو کو اخذ کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔ اس رجحان کے تحت حضورؐ کی یاد تازہ کرنے کے لیے جو تقاریب منعقد ہوتی ہیں ان میں کہنے کو تو ایک خاص طرح کی باتیں ہمیشہ کہی جاتی ہیں مگر زندگی پر ان کا کوئی اثر نمودار نہیں ہوتا۔

تیسرا غلط نقطۂ نظر وہ ہے جو حضورؐ کے پیغام کو ایک نظامِ حیات کا پیغام نہیں سمجھتا بلکہ ایک مذہب کا پیغام قرار دیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جو لوگ متاثر ہیں ان کا تصور یہ ہے کہ حضورؐ بس چند اعتقاد، چند رسومِ عبادات، چند اوراد و وظائف، چند اخلاقی سفارشیں اور چند فقہی احکام پہنچانے آئے تھے۔ اور آپ کا منشا ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو شخصی طور پر مسلمانی کی شان پیدا کر کے ہر گندے سے گندے نظام کے لیے بہترین کارکن ثابت ہوں۔ ایسا عنصر

حضورؐ سے بس طہارت، نماز روزے، نوافل و اذکار اور انفرادی اخلاق کی حد تک انتساب فیض کرتا ہے، لیکن تمدنی زندگی کے وسیع تر معاملات میں وہ پوری شانِ بے حسی کے ساتھ ہر باطل کے کام آتا ہے اور ہر فساد کے ساتھ سازگاری کر لیتا ہے۔ اس عنصر نے گویا سیرتِ نبویؐ کی مقدس کتاب کے بے شمار زریں ابواب کو فراموشی کی سرزمین میں دفن کر دیا ہے اور بس ایک مقدمہ کی فصل کو لے کر اسی میں کھو گئے ہیں۔ اس عنصر نے اب تک حضورؐ کی جو ترجمانی کی ہے اس سے متاثر ہو کر دورِ حاضر کی کوئی غیر قوم تو کجا، خود تعلیم یافتہ نوجوان مسلم تک یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حضورؐ ان کے لیے قافلہ سالارِ تمدن بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی بارگاہ سے تازہ ترین کٹھن مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل بھی مل سکتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر بھی حضورؐ کی ہستی کے لیے ایک مقدس حجاب بن گیا ہے۔

یہ غلط نقطہ ہائے نظر پنپ اس لیے رہے ہیں کہ فضا ان کے لیے سازگار ہے۔ فضا یوں سازگار ہے کہ جس نظامِ سیاست و تمدن اور جس ہیئتِ معیشت و معاشرت سے ہم دوچار ہیں اسے ایک خاص نقشے کا انسان درکار ہے۔ اس مشین کو خاص ڈھنگ کے پرزوں کی ضرورت ہے۔ وہ بالکل دوسری ہی سیرت افراد میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا کام ایک اور ہی طرز کے ذہن و کردار سے چلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یہاں عملی زندگی کو سرے سے اس نمونۂ انسانیت کی ضرورت ہی نہیں ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پیش کرتی ہے۔ اور اس منڈی میں اس متاعِ فکر و عمل کی مانگ ہی نہیں ہے جو آنحضورؐ کی زندگی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا اجتماعی نظام جس طرز کے وزیر اور حکام، جج اور وکیل، لیڈر اور صحافی، سپہ سالار اور سپاہی، کوتوال اور پیادے، تحصیل دار اور پٹواری، ڈپٹی کمشنر اور نمبردار، زمیندار اور مزارع، مصنف اور ادیب اور عامل قلی اور مزدور مانگتا ہے ان کا نقشۂ انسانیت اس سے بالکل متضاد قسم کا ہے جس کا مظاہرہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کے اسٹیج پر فرمایا۔ چھائے ہوئے نظام کی مانگ کے مطابق گھر گھر میں ماؤں کی محبت کی گودیں اور باپوں کی شفقت کی نگاہیں اولادوں کو پال رہی ہیں۔ اس کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر ادارہ ہائے تعلیم و تربیت بیس بیس سال تک ایک ایک فرد پر صرف کر کے کام کے پرزے بنا رہے ہیں اور اسی کے تقاضوں کے تحت ہر

صاحبِ شعور خود اپنے ذہن و کردار کو ایک خاص شکل دینے میں ساری عمر مصروف رہتا ہے۔ یہ نظام جن جن چیزوں کو پسند کرتا ہے انہی کو معاشرہ اپنے افراد میں از خود پیدا کرتا رہتا ہے اور یہ جن جن چیزوں کو حقارت و کراہت سے دیکھتا ہے، ماحول کی پوری طاقت ان کو مٹانے کے درپے رہتی ہے۔ یہ نظام جس بولی کو پسند کرتا ہے زبانیں آپ سے آپ اسی بولی کو بولنے لگتی ہیں، یہ جس لباس کو پسند کرتا ہے وہ لباس از خود زیبِ بدن ہونے لگتے ہیں، یہ ایک اشارہ کرتا ہے تو قدیمی حیادار گھرانوں کی بہو بیٹیوں کے چہروں سے نقابیں اُلٹ جاتی ہیں۔ عزت کی روش وہ ٹھہرتی ہے جسے مروجہ نظام رائج کرنا چاہے اور ذلت کا طرز وہ قرار پاتا ہے جسے چلتا ہوا تمدن ناپسند کرے۔ جن فنون کو یہ پسند کرتا ہے وہ ذریعۂ مقبولیت بنتے ہیں اور جن مشاغل کو یہ مسترد کرتا ہے وہ نذرِ تغافل ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنی اقدار خود بناتا اور تمام افراد سے انہیں منواتا ہے اور دوسری نظام ہائے اقدار اور شعائر کو مرجھا جانا پڑتا ہے۔ کچھ حمیت دار افراد اور خاندان ماحول کے جبری دھارے کے خلاف زور کرتے ہیں، مگر معاشی محرومی، ثقافتی پسماندگی اور احساس کہتری کا دباؤ اتنا سخت ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیراک مضمحل ہو کر اپنے آپ کو ماحول کے حوالے کرتے جاتے ہیں، ورنہ ان کی اگلی نسل ہمت چھوڑ بیٹھتی ہے۔ اب ایک دنیا کی دنیا جو اپنی سیرت کی تشکیل شعوری طور پر بھی اور غیر شعوری طور پر بھی ماحول کے منشا کے مطابق کرنے میں مگن ہے۔ وہ سرورِ عالم کی سیرت پر کتابیں اگر لکھے اور پڑھے گی اور وعظ سنائے اور سنے گی تو اسوۂ حسنہ کا ذوق لوگوں کے اندر آئے گا کہاں سے؟

سچی بات یہ ہے کہ سیرتِ نبوی میں ان لوگوں کے لیے کوئی پیغام ہے ہی نہیں جو کسی غیر اسلامی نظام سے بات بنا رکھنا چاہتے ہوں اور جن کے مفاد کے سودے کسی باطل سے چُک گئے ہوں۔ یہ لوگ سیرت پڑھ کر سر دُھنتے ہوں گے، ان کو ذہنی حظ ملتا ہو گا، ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہو گا لیکن ان میں یہ تحریک کہاں سے آئے گی کہ وہ اس سیرت کے سانچے میں زندگی کو ڈھالیں۔ ان کا جمود کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی داستانِ حیات رستم و سہراب کا قصہ نہیں الف لیلہ

کی کہانی نہیں اور کسی خیالی کردار کا افسانہ نہیں۔ اس کا مقام یہ ہرگز نہیں کہ اسے ہم علم و ادب کی تفریحی چہل پہل کا محض ایک سرمایۂ رونق بنائیں۔ اس کی قدر و قیمت اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسے محض ذہنی لذّت حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں۔ اس کا احترام روکتا ہے کہ ہم اسے مجرّد قومی تفاخر کے جذبہ کی تسکین کا ذریعہ بنائیں۔

یہ مختلف غلط نقطہ ہائے نظر ہمارے یہاں مل جُل کر کام کر رہے ہیں اور یہی اصل مقصد میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ کون شمار کر سکتا ہے کہ ہر سال کتنی مجالس میلاد اور جلسہ ہائے سیرت ہمارے ملک میں منعقد ہوتے ہونگے؟ ایک ربیع الاول ہی کے مہینے میں کتنے وعظ اور کتنی تقریریں ہوا میں لہریں اٹھا دیتی ہونگی؟ کتنے مقالے اور کتابیں لکھی جاتی ہونگی؟ کتنے جرائد کے خاص نمبر اس موضوع پر شائع ہوتے ہوں گے؟ شعرا کتنی نعتیں لکھتے ہوں گے اور قوال ان کو کہاں کہاں گاتے پھرتے ہونگے؟ اکابر کی طرف سے کتنے ہی پیغامات اور بیانات نشر ہو جاتے ہوں گے؟ دعوتوں اور ضیافتوں کی کیسی کچھ بہاریں دستر خوانوں پر آتی ہوں گی؟ بازاروں کو سجانے اور دروازے اور محرابیں بنانے میں کتنا روپیہ کھپا دیا جاتا ہوگا؟[۱]

لیکن دوسری طرف یہ بھی تو ذرا سوچیے کہ ایک اچھے مقصد پر قوتوں اور روپے کے اس صرف کا واقعی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ جائزہ کی ترازو کے ایک پلڑے میں اپنی ایک سال کی ان سرگرمیوں کو رکھیے اور دوسرے پلڑے میں حاصل شدہ نتائج کو رکھ کر جانچیے کہ کیا وزن ٹھیک نکلتا ہے؟ کتنے افراد ہونگے جو ان نیک مساعی کی بدولت سیرت نبوی کے سانچے میں اپنی زندگیاں ڈھالنے کی مہم میں ہر سال لگ جاتے ہونگے؟ اگر ایک جلسے اور ایک مقالے اور ایک نعت کے ذریعے صرف ایک ہی آدمی بدلا ہوتا تو اندازہ کیجیے کہ گذشتہ دو سو سال کا کیا حاصل ہونا چاہیے تھا؟ اور اگر عملاً حاصل

[۱] آہستہ آہستہ نبی اکرمؐ کی یادگار تقریبوں میں مسرت و تفریح اور کھیل تماشوں کا عنصر بہت بڑھتا جا رہا ہے۔ بلکہ کھلے کھلے ہنگامہ ہائے فسق و فجور بھی عمل میں آنے لگے ہیں یعنی معاشرہ ٹھیک اس پیغام کے اُلٹی سمت چل پڑا ہے جو سیرت میں مضمر ہے۔

وہ نہیں ہے تو کہیں نہ کہیں ہماری مساعی میں کوئی کوتاہی موجود ہے اور وہ کوتاہی بڑی بنیادی قسم کی ہے میرا حاصلِ مطالعہ و تحقیق یہ ہے کہ ہم نے مطالعۂ سیرت کا صحیح بنیادی نقطۂ نظر گم کر دیا ہے اور اوپر کے غلط نقطہ ہائے نظر کار فرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ کی محبت و عقیدت کے بے شمار مظاہر موجود ہونے کے باوجود اور سیرت پر دماغی کاوشیں صرف ہونے کے باوجود ہماری تاریخ کے افق سے وہ نیا انسان طلوع نہیں ہو رہا جس کا نمونۂ کامل حضورؐ پاک نے پیش فرمایا تھا۔

حضورؐ کی سیرت ہمارے اندر بجز اس کے کسی طرح جلوہ گر نہیں ہو سکتی کہ ہم اسی نصب العین کے لیے ویسی ہی جد و جہد کرنے اٹھیں جس کے لیے حضورؐ کی پوری زندگی کو ہم وقف پاتے ہیں۔ وہی جد و جہد اپنے ڈھب کی سیرت پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے اور مصرف بھی!!

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک فرد کی سیرت نہیں ہے بلکہ وہ ایک تاریخی طاقت کی داستان ہے جو ایک انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوئی۔ وہ زندگی سے کٹے ہوئے ایک درویش کی سرگزشت نہیں ہے جو کنارے بیٹھ کر محض اپنی انفرادی تعمیر میں مصروف رہا ہو۔ بلکہ وہ ایک ایسی ہستی کی آپ بیتی ہے جو ایک اجتماعی تحریک کی روحِ رواں تھی۔ وہ محض ایک انسان کی نہیں، ایک انسان ساز کی روداد ہے۔ وہ عالمِ نو کے معمار کے کارنامے پر مشتمل ہے۔ ایک پوری جماعت، ایک انقلابی تحریک اور ایک ہیئتِ اجتماعیہ اس کارنامے کی تفصیل اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ سرورِ عالم کی سیرت غارِ حرا سے لے کر غارِ ثور تک، حرمِ کعبہ سے لے کر طائف کے بازار تک، امہات المومنین کے حجروں سے لے کر میدان ہائے جنگ تک چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے نقوش بے شمار افراد کی کتابِ حیات کے اوراق کی زینت ہیں۔ ابوبکر و عمر، عثمان و علی، عمار و یاسر، خالد و ولید اور بلال و صہیب (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سب کے سب ایک ہی کتابِ سیرت کے اوراق ہیں۔ ایک چمن کا چمن ہے کہ جس کے لالہ و گل اور نرگس و نسترن کی ایک ایک پتی پر اس چمن کے مالی کی زندگی مرقوم ہے۔ وہ قافلۂ بہاری وقت کی جس سرزمین سے گزرا ہے اس کے ذرے ذرے پر نکہت کی مہریں ثبت کر گیا ہے۔

دنیا کی اس بلند ترین شخصیت کو اگر سیرت نگاری میں مجرد ایک فرد بنا کے پیش کیا جائے اور سوانح نگاری کے مروجہ طرز پر اس کی زندگی کے بڑے بڑے کاموں، اس کی نمایاں مہمات اور اس کے اخلاق و عادات کو بیان کر دیا جائے، کچھ تاریخوں کی چھان بین اور کچھ واقعات کی کھوج کرید کر دی جائے تو ایسی سیرت نگاری سے صحیح منشا ہرگز پورا نہ ہو گا۔

پھر سرورِ عالم کی زندگی کی مثال ایک جوہڑ کے کھڑے پانی کی نہیں ہے کہ جس کے ایک کنارے کھڑے ہو کر ہم بیک نظر اس کا جائزہ لے ڈالیں۔ وہ ایک بہتا ہوا دریا ہے جس میں حرکت ہے، روانی ہے، کشمکش ہے، موج و حباب ہیں، سیپیاں اور موتی ہیں، اور جس کے پانی سے مردہ کھیتیوں کو مسلسل زندگی مل رہی ہے۔ اس دریا کا رمز آشنا ہونے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ رواں رہنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی بہت سی کتابیں پڑھ کر نادر معلومات ملتی ہیں، لیکن ہمارے اندر تحریک پیدا نہیں ہوتی، جذبے انگڑائی نہیں لیتے، عزم و ہمت کی رگوں میں نیا خون نہیں دوڑتا، ذوقِ عمل میں نئی حرارت نہیں آتی؛ ہماری زندگیوں کا جمود نہیں ٹوٹتا۔ وہ شرارِ آرزو ہم اخذ نہیں کر پاتے جس کی گرمی نے ایک یکہ و تنہا اور بے سروساماں فرد کو قرنوں کے جمے ہوئے فاسد نظام کے خلاف معرکہ آرا کر دیا۔ وہ سوز و سازِ ایماں ہمیں نہیں ملتا جس نے ایک یتیم بے نوا کو عرب و عجم کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا بنا دیا۔

اصل میں حضورؐ معروف اصطلاح کے محدود تصور کے مطابق فقط ایک "بڑے آدمی" نہ تھے۔ آپؐ کی سیرت ایک ایسے "بڑے" یا "مشہور" آدمی کی داستان نہیں ہے۔ جیسے لوگوں کو مشاہیر کے سوانحی سلسلوں میں گنوا دیا جاتا ہے۔ یہ ہستی "بڑے" اور "مشہور" آدمیوں سے بہت اوپر کی ہے۔

دنیا میں بڑے آدمی بہت پیدا ہوئے اور ہوتے ہیں۔ بڑے لوگ وہ بھی ہیں جنہوں نے کوئی اچھی تعلیم اور کوئی تعمیری فکر پیش کر دی، وہ بھی ہیں جنہوں نے اخلاق و قانون کے نظام سوچے، وہ بھی ہیں جنہوں نے اصلاحِ معاشرہ کے کام کیے، وہ بھی ہیں جنہوں نے ملک فتح کیے اور بہادرانہ کارناموں کی میراث چھوڑی، وہ بھی ہیں جنہوں نے سلطنتیں چلائیں، وہ بھی جنہوں نے فقر و درویشی

کے عجیب عجیب نمونے ہمارے سامنے پیش کیے، وہ بھی ہیں جنہوں نے دنیا کے سامنے انفرادی اخلاق کا اونچے سے اونچا معیار قائم کر دکھایا ۔۔۔ مگر ایسے بڑے آدمیوں کی زندگیوں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو بالعموم یہی دیکھتے ہیں کہ ان کی قوتوں کا سارا رس زندگی کی کسی ایک شاخ نے چوس لیا اور باقی ساری ٹہنیاں سوکھی رہ گئیں۔ ایک پہلو اگر بہت زیادہ روشن ملتا ہے تو کوئی دوسرا پہلو تاریک دکھائی دیتا ہے، ایک طرف افراط ہے تو دوسری طرف تفریط! لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ دوسرے گوشوں کے ساتھ پوری طرح متوازن بھی ہے اور پھر ہر گوشہ ایک ہی طرح کے کمال کا نمونہ ہے۔ جلال ہے تو جمال بھی ہے، روحانیت ہے تو مادیت بھی ہے، معاد ہے تو معاش بھی ہے، دین ہے تو دنیا بھی ہے۔ اک گونہ بے خودی بھی ہے مگر اس کے اندر خودی بھی کارفرما ہے۔ خدا کی عبادت ہے تو اس کے ساتھ بندوں کے لیے محبت و شفقت بھی ہے، کڑا اجتماعی نظم ہے تو فرد کے حقوق کا احترام بھی ہے، گہری مذہبیت ہے تو دوسری طرف ہمہ گیر سیاست بھی ہے قوم کی قیادت میں انہماک ہے مگر ساتھ کے ساتھ ازدواجی زندگی کا کھیڑا بھی نہایت خوبصورتی سے چل رہا ہے، مظلوموں کی دادرسی ہے تو ظالموں کا ہاتھ پکڑنے کا اہتمام بھی ہے۔

آپؐ کی سیرت کے مدرسے سے ایک حاکم، ایک امیر، ایک وزیر، ایک افسر، ایک ملازم، ایک آقا، ایک سپاہی، ایک تاجر، ایک مزدور، ایک جج، ایک معلم، ایک واعظ، ایک لیڈر، ایک ریفارمر، ایک فلسفی، ایک ادیب، ہر کوئی یکساں درسِ حکمت و عمل لے سکتا ہے۔ وہاں ایک باپ کے لیے، ایک بیٹے کے لیے، ایک بھائی کے لیے، ایک شوہر کے لیے، ایک دوست کے لیے، ایک ہم سفر کے لیے، ایک پڑوسی کے لیے یکساں مثالی نمونہ موجود ہے۔ ایک بار جو کوئی اس درس گاہ تک آپہنچتا ہے، پھر اسے کسی دوسرے دروازے کو کھٹکھٹانے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انسانیت جس آخری کمال تک پہنچ سکتی تھی وہ اس ایک ہستی میں جلوہ گر ہے اسی لیے میں اس ہستی کو "انسانِ اعظم" کے لقب سے پکارنے پر مجبور ہوا۔ تاریخ کے پاس انسانِ اعظم صرف یہی ایک ہے جس کو چراغ بنا کر ہر دور میں ہم ایوانِ حیات کو روشن کر سکتے ہیں۔ کمزور دل

افرادِ انسانی نے اس سے روشنی لی، لاکھوں بزرگوں نے اپنے علم و عمل کے دیے اسی کی لَو سے جلائے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں اس کا پیغام گونج رہا ہے اور دیس دیس کے تمدن پر گہرے اثرات اس کی دی ہوئی تعلیم کے پڑے ہیں۔ کوئی انسان نہیں جو اس "انسانِ اعظم" کا کسی نہ کسی پہلو سے زیرِ بارِ احسان نہ ہو۔ لیکن اس کے احسان مند اس کو جانتے نہیں، اسے تعارف نہیں رکھتے

اس کی ہستی کے تعارف اور اس کے پیغام کے فروغ کی ذمہ داری اس کی قائم کردہ جماعت پر تھی، لیکن وہ جماعت خود ہی اس سے اور اس کے پیغام سے دُور جا پڑی ہے۔ اس کے پاس کتابوں کے اوراق میں کیا کیا کچھ موجود نہیں، لیکن اس کی کھلی ہوئی کتابِ عمل کے اوراق پر انسانِ اعظم کی سیرت کی کوئی تصویر دکھائی نہیں دیتی۔ اس جماعت اور قوم کی مذہبیت، اس کی سیاست، اس کی معاشرت، اس کے اخلاق، اس کے قانونی نظام اور اس کے کلچر پر اس سیرت کے بہت ہی دھندلے نشانات باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی بے شمار نئے نئے نقوش میں خلط ملط ہو کر مسخ ہو رہے ہیں۔ اس جماعت یا قوم کا اجتماعی ماحول زمین کے کسی ایک چپے پر بھی یہ گواہی نہیں دیتا کہ میں محمدؐ کے دیئے ہوئے اصولوں اور اس کی قائم کردہ روایات و اقدار کا آئینہ دار ہوں۔ بلکہ الٹا یہ جماعت اور یہ قوم دنیا کے مختلف فاسد نظاموں کے دروازوں پر بھیک مانگتی پھرتی ہے اور ہر قائم شدہ طاقت سے مرعوب ہو ہو کر اپنے سرمایۂ افتخار پر شرمسار ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے قرآن کو غلافوں میں لپیٹ دیا اور انسانِ اعظم کی سیرت کا گلدستہ بنا کر طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔

دوسرا غضب یہ ڈھایا کہ اپنے آپ کو ایک مذہبی و قومی جتھے میں بدل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو محض اپنے قومی و مذہبی رہنما کی حیثیت دے دی اور اس بین الاقوامی ہستی کے پیغام اور نمونۂ حیات کو گروہی اجارہ بنا لیا۔ حالانکہ آپ ساری انسانیت کے رہنما بن کر آئے تھے اور ساری انسانیت کے لیے پیغام اور نمونہ لائے تھے۔ ضرورت سیرت کو اس انداز سے پیش کرنے کی تھی کہ انسانیت کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جس کے سانچے میں ڈھل کر انسان اپنے اور اپنے ابنائے نوع

کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اور مسائل کے گوناگوں خارزاروں سے نجات پاکر ایک پاکیزہ نظامِ زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ حضورؐ کا پیغام اور اُسوہ درحقیقت سورج کی روشنی اور بارش کے پانی اور ہوا کے جھونکوں کی طرح کا فیضانِ عام تھا، لیکن اسے ہم نے اپنی نااہلی سے گروہی خول میں بند کر لیا۔ آج افلاطون، سقراط، ڈارون، میکیاویلی، مارکس، فرائڈ اور آئنسٹائن سے تو ہر ملک و مذہب کے لوگ تھوڑا یا بہت استفادہ کرتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے کسی کے خلاف کسی گروہ میں اندھا تعصب کارفرما نہیں ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور اور علم اور رہنمائی سے استفادہ کرنے میں بے شمار تعصبات حائل ہیں۔ لوگ یوں سوچتے ہیں کہ محمدؐ تو مسلمانوں کے ہیں اور مسلمان ہم سے الگ اور ہم مسلمانوں سے الگ ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے ہادی و رہبر سے ہمارا کیا واسطہ! افسوس ہے کہ اس تاثر کے پیدا ہونے اور غیر معمولی حد تک جا پہنچنے میں ہمارے اپنے طرزِ عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ خود ہم ہیں کہ جنھوں نے محسنِ انسانیتؐ کی نہایت غلط نمائندگی کی ہے۔

سرورِ عالمؐ کی ہستی تاریخِ انسانی کے دو بڑے ادوار کے درمیان واقع ہے۔ بعثتِ محمدی کے مقام سے کھڑے ہو کر دیکھیں تو ہمارے پیچھے قبائلی، جاگیردارانہ، بادشاہتی اور روایتی و اوہامی دورِ تمدن پھیلا دکھائی دیتا ہے۔ سامنے دیکھیں تو آفاقی و بین الاقوامی، عوامی و جمہوری، عقلی و استدلالی، ترقیاتی و ایجادی دورِ تمدن کی پہلی شعاعوں کا قافلہ دور کے افق سے اُمڈتا دکھائی دیتا ہے۔ اس دورِ عقل و ترقی کا افتتاح خود سرتاجِ انسانیت ہی کے ہاتھوں کرایا گیا اور آنے والے دور کے لیے ایسے اصول دنیا کو فراہم کر دیے گئے جو قیامت تک کارگر ہو سکیں اور ان اصولوں کے ساتھ ایک ایسا انسان تیار کر کے دکھا دیا گیا جو آنے والی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ حضورؐ کے ذریعے اسی آنے والے دور کی ضروریات کے لحاظ سے روح اور بدن، اخلاق اور مادیت، عقلیت اور جذبات، اعتقاد اور عمل، خواہش اور فرض، فرد اور جماعت کے احوال اور تقاضوں کے درمیان معجزانہ نوعیت کا توازن قائم کرا دیا گیا۔ آپؐ کے ہاتھوں ایک ایسی جماعت کی تاسیس کرائی گئی جو ایک طرف دنیا سے بے نیاز تھی اور دوسری طرف دنیا پر حکمرانی

کرنی تھی، ایک طرف خدا پرستی میں بے مثال تھی اور دوسری طرف مادہ پر کارفرمائی کرنے کے لحاظ سے پیش پیش تھی، ایک طرف حق کے مقابلے میں انتہائی عاجزی سے سر جھکا دینے والی تھی اور دوسری طرف باطل کا زور توڑنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دینے والی تھی، ایک طرف اپنے آپ کو رضائے الٰہی کی تحویل میں دیئے ہوئے تھی اور دوسری طرف فطرت کی قوتوں کو رام کر کے ان سے کام لینے میں چاق وچوبند تھی۔ یہ طاقت جونہی تاریخ کے ایوان میں داخل ہوئی اس نے علم وحکمت کے فانوس روشن کر دیئے، اس نے ایجادات کے دروازے کھول دیئے اور اس نے ادارات کی تنظیم کے نئے نئے تجربات نہایت تیزی سے کر ڈالے اور اس کی ساری حرکت، اس کی ساری ترقیات، اس کے علوم اور ایجادات، اس کے تمدنی و تہذیبی کارناموں کا اصل کریڈٹ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ مغربی قومیں جن کے قبضے میں آگے چل کر اس عقلی و جمہوری دور کی باگ ڈور آئی، محمدؐ اور اس کے پیغام اور اس کے پیش کردہ نظام کو نہ سمجھ سکے۔ وہ ہستی جس کا کارنامہ مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے پس منظر میں جگمگا رہا ہے اور وہ ہستی جو جمہوریت اور بین الاقوامیت کے پردوں کے پیچھے مسکرا رہی ہے اور وہ ہستی کہ جس کا ہاتھ مذہبی اصلاح (REFORMATION) کی تحریک کی ڈور ہلانے والا تھا اس کو یورپ کا روشن دماغ انسان نہ دیکھ سکا اور نہ سمجھ سکا! اس کے کئی اسباب ہیں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں اجمالاً ان اسباب کا ذکر کریں:

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا پیغام لے کر اٹھے تو آپؐ کو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں سے سابقہ پیش آیا۔ دونوں مذہب اس وقت فساد اور انحطاط کے افسوسناک دور سے گزر رہے تھے، ایمانی و اخلاقی روح سے خالی ایک رسمیاتی ڈھانچہ شانِ تقدس کے ساتھ دونوں کے ہاں کھڑا تھا۔ دونوں گروہوں میں مذہبی طبقات پیدا ہو چکے تھے اور انہوں نے کاروباری ذہن کے ساتھ اپنے مفاد کی دکانیں کھول لی تھیں۔ فکر و عمل کی حقیقی متاع لٹ چکی تھی، صرف باہر چمکدار سائن بورڈ آویزاں تھے سارا زور اپنی اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے اور اپنے اپنے آدمیوں کو اس کے دائرے میں روک رکھنے

پر تھا۔ تہذیب کی اصلاح اور آدمیت کا بھلا کسی کے سامنے نہ رہا تھا۔ ان حالات میں بحیثیت مجموعی یہودیوں اور عیسائیوں کی ذہنیت اتنی بگڑ چکی تھی کہ انہوں نے محمدؐ کی قیمتی شخصیت کو جانچنے اور اس کے پیغام کو پرکھنے اور اس کے پیش کردہ نظام کا جائزہ لینے کے بجائے اس کے خلاف ضد اور تعصب اور حسد اور کینہ کے محاذ قائم کر لیئے۔ اس کی دعوت کا مقابلہ کیا، اس کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکائے، اس کے ساتھ عہد شکنیاں اور غداریاں کیں، اس کی تعمیر کو ڈھا دینا چاہا اور اس کے قتل کی تدبیریں کیں۔ پھر اپنے ان کرتوتوں کے فطری نتائج سے جھولیاں بھریں۔ اس طرح تاریخ کے بہتے پانی کو گندے جذبات اور گھٹیا حرکات سے گدلا کیا اور یہی گدلا پانی بہ بہ کر بعد کی نسلوں تک پہنچا۔ انہوں نے کینے اور تعصب کی ایک میراث پیدا کی اور وہ میراث بعد کے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے محفوظ چھوڑ گئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی فاسد جذباتی ردعمل آج تک ان کے اخلاف کے ذہنوں میں منعکس ہو رہا ہے

۲۔ اسلام سے قبل کی انسانی دنیا کے اندر مذہبی دائرے میں بھی اور سیاسی میدان میں بھی عیسائیوں کو نمایاں غلبہ حاصل تھا اور پھیلاؤ کی امنگیں کام کرنے کے لیے بڑی وسیع جولانگاہ سامنے رکھتی تھیں۔ لیکن اسلام کے ابھرنے سے گویا ان کی نگاہ میں ایک حریف طاقت آ ابھری اور آہستہ آہستہ نشو و نما پا کر دنیا بھر میں ایک فیصلہ کن طاقت بن گئی۔ اس وجہ سے عیسائیت کے سینے میں رقیبانہ جذبات پیدا ہو کر بڑھتے ہی چلے گئے۔ پھر عملاً اسلام کی طاقت نے عیسائیت کے ہاتھوں سے تسلط و اقتدار کی باگیں کرۂ ارضی کے مختلف حصوں میں چھین کر اس کے ردعمل کو اور زیادہ شدید بنا دیا۔ تاریخ کے میدان میں کھلے اور برابر سرابر کے مقابلے میں عیسائیوں نے اسپورٹس مین اسپرٹ دکھانے کے بجائے اپنے اندر ایک کد اور ایک چڑ پیدا کر لی۔ یہ کد اور چڑ بنیادی طور پر مسلمانوں کے خلاف تھی اور بالواسطہ طور پر اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کھچاؤ بڑھتا گیا۔ یہ کھچاؤ صلیبی جنگوں کے دور میں اپنی آخری انتہا تک جا پہنچا۔ اس دور تک آتے آتے

چونکہ خود مسلمانوں میں انحطاط اپنا عمل کر چکا تھا اس لیے ان کی خاص خاص کمزوریاں اور بے راہ رویاں اسلام اور سرورِ عالم کے ساتھ منسوب کی جانے لگیں اور مسلمانوں کے عمل و کردار کے رنگوں سے سیرتِ محمدیؐ کی ایک غلط تصویر تیار کی جانے لگی۔

۳۔ اسلام اور عیسائیت کے اس طویل دورِ کشمکش کے ابتدائی حصے میں پادری گروہ چونکہ اپنے عیسائی عوام کو ذہنی لحاظ سے کامل طور پر اپنے تصرف میں لیے ہوئے تھا اور اسلام اسی گروہ کے طبقاتی مفاد پر ضرب لگانے کا موجب ہوا تھا، اس لیے اس گروہ نے محسن انسانیت اور اس کے پیغام کا ایک جھوٹا تصور گھڑا اور گھڑ گھڑ کر اسے گلی گلی پھیلایا۔ قرنوں کے اس پروپیگنڈے نے مغرب کے ذہن کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ آج بھی سرے سے مذہب کا انکار کرنے والے اور عیسائیت سے آزاد ہو کر سوچنے والے اربابِ عقل تک جب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہیں تو وہ آج سے چھ صدی قبل کے تنگ دل اور تاریک خیال پادریوں سے ذہنی سطح میں کچھ بھی بلند نہیں ہوتے۔ چنانچہ اٹھا کے دیکھ لیجیے مستشرقین کی کتابوں کو کہ کتنی غلط اور ناقص معلومات کس مفسدانہ طریق سے مرتب کر کے لائی گئی ہیں اور دنیا کے سب سے بڑے انسان کی تصویر کس نامعقولیت سے کھینچی گئی ہے۔ کوئی ایک آدھ استثنائی مثال مل جانا اور چیز ہے، یہاں تو اس عمومی انداز کا ذکر ہے جو اہلِ مغرب کے ہاں پایا جاتا ہے۔

۴۔ گذشتہ دو صدی کا عہد مغربی امپیریلزم کا شیطانی عہد ہے۔ اس عہد میں مسلمان قومیں اسلام سے انحراف، خدا سے بغاوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں سے گریز کی سزا پانے کے لیے ایک ایک کر کے مادہ پرست مغرب کے شہنشاہی عزائم کی شکار ہونے لگیں۔ مغرب کے شہنشاہی عزائم کو مسلمانوں کے اندر ہر جگہ ایک سخت درجہ کی مزاحم روح کارفرما ملی اور یہ روح ہر جگہ مذہبی روح تھی۔ اسلام نے توحید کا جو تصور دیا ہے وہ حریت و آزادی اور مساوات کے ایسے احساسات ابھارتا ہے کہ جو اسلام کے ماننے والوں کو غلامی پر رضامند نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ مسلمانوں کے اندر مغربی امپیریلزم کے خلاف جتنی بھی تحریکیں برپا ہوئی ہیں ان کے اندر اسلام کی حرارت کام کر رہی تھی ہر جگہ دینی شخصیتیں

رہنمائی کرتی نظر آتی ہیں اور ہر جگہ نظامِ اسلامی کے احیاء کے ولولے کارفرما رہے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ممالک کی تمام تحریکات آزادی میں دینی داعیہ پورے زور سے برسرِ عمل ملتا ہے۔ چنانچہ مغرب کے شہنشاہی صیادوں میں اس قوت کے خلاف از سرِ نو ایک چڑ پیدا ہوئی جو قدم قدم پر ان کا راستہ روکتی تھی اور بار بار ناقابلِ تسخیر ولولے اُبھارتی تھی۔ چنانچہ اس چڑ کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبیت کو جنونی پن سے تعبیر کیا گیا اور "ملازم" کو ایک خوفناک ہوّا بناکر پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی رُوحِ دینی کچھ ایسی سخت جان پائی گئی کہ جو آسانی سے مغربی فکر اور کلچر کے سامنے شکست کھانے والی نہیں تھی بلکہ جس نے ہر ہر دیس میں اس کا مقابلہ کیا ہے۔ تعلیم اور لٹریچر اور اثراندازی کی پوری قوتیں صرف کرکے مغربی امپیریلزم نے برسوں میں جاکر مسلمان قوموں کے اندر سے اپنے حق میں ایک معمولی سی اقلیت حاصل کی اور اسے سہارا دے کر اقتدار تک پہنچایا اور پھر اسے مسلمانوں کے اسلامی رجحانات کے خلاف فکری، سیاسی و تہذیبی معرکے میں خوب خوب استعمال کیا۔ ان حالات میں اسلام اور اسے پیش کرنے والی ہستی سے مغرب کا کھچاؤ بڑھتا ہی گیا۔

۴۔ مغربی قومیں جب مسلمانوں کو غلام بنانے میں کامیاب ہوگئیں تو ان کے لیے یہ مشکل ہو گیا کہ جو طاقت سیاسی و مادّی اور تنظیمی و تہذیبی لحاظ سے ان سے پست ہے وہ اس سے نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کا درس لے سکیں اور اسے برپا کرنے والی ہستی کا احترام کرسکیں۔ پھر جب مسلمانوں کو انہوں نے اپنی ذہنی تقلید میں مبتلا دیکھا اور ان پر مرعوبیت کی کیفیت کی پرچھائیں پڑی دیکھی تو اس چیز نے اور بڑی رکاوٹ پیدا کردی۔ انہوں نے جب اپنے تیار کردہ روشن خیال مسلمانوں کو اسلام کو مغربی نقطۂ نگاہ کے مطابق ڈھالنے دیکھا تو اسلام اور اس کے داعی کی وقعت ان کی نگاہوں میں اور کم ہوگئی۔ مسلمانوں کے معذرت خواہانہ نقطۂ نظر نے اسلام کے وقار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو بڑا نقصان پہنچایا۔

ان سارے وجوہ و اسباب کے تحت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مغرب کے انسان کے درمیان

آہنی دیواریں کھڑی ہوگئیں۔

آج مغرب محسنِ انسانیتؐ کو محض مسلمانوں کے گروہی رہنما کی حیثیت سے لیتا ہے اور سمجھنے سمجھانے کے نقطۂ نگاہ کے بجائے معترضانہ اور مخالفانہ اور مناظرانہ ذہن کے ساتھ سیرت کا مطالعہ کرتا ہے۔ چنانچہ مغرب نے اس بلند مرتبہ ہستی کی جو تصویر اپنے لٹریچر میں تیار کی ہے وہ ایک ایسے آدمی کا نقشہ سامنے لاتی ہے جو نفسیاتی صحت و توازن سے محروم ہے، جس کی ساری تگ و دو لاشعوری محرکات کے ردِ عمل سے پیدا شدہ خبط کا نتیجہ ہے، وہ تیغ خونخوار ہاتھ میں لیے جدھر بڑھتا ہے قتل عام کرتا چلا جاتا ہے۔ اس پیکرِ رحمت کو ایک دنیا طلب اور جاہ پسند جنگجو کا مرتبہ دے دیا گیا ہے اور اس کے مخلصانہ کام کو ایک فراڈ بنا دیا گیا ہے۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ تحریکِ اسلامی میں جو جو کچھ اچھے پہلو تھے وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے مستعار لیے گئے تھے، ورنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر اپنا کوئی جوہرِ قابل نہ تھا۔ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ روحانیت و مذہبیت کا سارا رنگ تو محض نمائشی تھا اور محض ڈرامائی تدابیر سے تسخیرِ عوام کر کے اپنی مطلب براری کی گئی تھی۔ آپ جیسے بھی چاہیں دنیا پرست اور حیلہ ساز آدمی کہہ سکتے ہیں، مگر سوال یہ ہوگا کہ ایسی شخصیت کے اندر اس طرح کا اعلیٰ اور بے داغ کردار کس طرح کھپایا جا سکتا ہے جس کا تجربہ ہمیں سرورِ عالمؐ کی پوری زندگی میں ہوتا ہے۔

پھر ظلم یہ ڈھایا جاتا ہے کہ اس صاحبِ دعوت ہستی کے پیش کردہ پیغام کا مطالعہ جڑ سے شروع کر کے ٹہنیوں اور برگ و بار تک نہیں پہنچایا جاتا بلکہ اساسی نظریہ کو سمجھے بغیر اور فکر کی جڑ کی ماہیت متعین کیے بغیر مناظرہ باز پادریوں کے نہج پر پڑ کر جزئیاتی مسائل کی چند کونپلوں کو لے لیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ داعیٔ اسلام نے تعددِ ازدواج کو جائز رکھا۔ مذہب کے لیے تلوار اٹھائی، جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز قرار دیا اور فلاں موقع پر یوں کیا اور فلاں معاملے میں یوں کیا۔ یہ طریقِ مطالعہ ہمیشہ متعصب اور مخالفانہ ذہن کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کے ذریعے کسی نظامِ زندگی کو اور کسی دین کو سمجھا نہیں جا سکتا بلکہ اس کے ذریعے تو بات کو سمجھنے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

دیکھنے اور جاننے اور سمجھنے کی اصل چیز نظریۂ اساسی ہے کہ وہ کہاں تک برحق ہے۔ اور اس سے زندگی کی بگڑی کہاں تک بنتی ہے۔ پھر اس نظریہ سے ماخوذ ہونے والے اصول دیکھے جاتے ہیں کہ جن پر زندگی کے مختلف شعبے استوار ہوتے ہیں۔ پھر ان اصولوں کے فریم میں جزئیات کی ترتیب دیکھی جاتی ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک قائم ہوتی ہے کہ نہیں۔ ایک شخص آپ کے سامنے زندگی کا ایک فلسفہ لے کے آتا ہے، آپ اس فلسفہ پر غور کرنے کے بجائے چند ایسے جزئی مسائل چھیڑ دیتے ہیں جن کے بارے میں آپ کے معاشرہ کا ایک خاص ذہن بنا بنایا چلا آتا ہے اور اس ذہن سے باہر نکل کر آپ سوچ نہیں سکتے نتیجہ یہ کہ خود مغالطوں میں پڑتے ہیں اور ہزارہا لوگوں کو تعصب میں مبتلا کرتے ہیں۔ ایک شخص انسانیت کا ایک مکمل نیا نقشہ اپنی ذات میں بنا کر سامنے آتا ہے، آپ اس نقشے کو مجموعی طور پر سمجھنے سے قبل اس کی دو ایک لکیروں اور نشانوں کو پکڑ کر بحث شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لکیریں اور یہ نشان یوں کیوں لگائے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر نقشے کی مجموعی ترتیب کو ڈھنگ سے سمجھا گیا ہوتا تو ان لکیروں اور نشانوں کی ماہیت بھی از خود سمجھ میں آجاتی۔ مغربی نظریات اور نظاموں کو سمجھنے کے لیے اور تاریخی شخصیتوں کا جائزہ لینے کے لیے جو انتہائی سائنٹفک انداز بالعموم استعمال میں لاتا ہے، وہی اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرتے وقت بالکل بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک باغ پر رائے قائم کرنے کے لیے اس کو مجموعی حیثیت سے سامنے رکھنا ہوتا ہے، نہ کہ اس کے اندر کی گھاس کی دو ایک پتیوں اور کسی پودے کی کونپلوں کو سارے باغ سے الگ کر کے زیر مطالعہ لایا جاتا ہو۔ آپ سیرت محمدیؐ اور پیغام محمدیؐ کے پورے چمن کو دیکھیں اور اس کی مجموعی ترتیب کو سمجھیں، پھر آپ کو اس کے اندر ایک ایک شاخ اور ایک ایک پتی کا مقام خود ہی سمجھ میں آجائے گا۔ اگر کسی نظام یا نظریے یا تحریک، یا قائدانہ شخصیت میں چند چیزیں آپ کے ذوق اور آپ کی پسندیدہ روایات اور عادات کے خلاف ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ بس وہاں کوئی قابل قدر چیز ہے ہی نہیں اور وہ پورا مجموعہ مسترد کر دینے کے قابل ہے۔ آخر آپ کا ذوق اور آپ کی پسند کوئی عالمی و تاریخی معیار نہیں ہے۔ ممکن ہے بلکہ لازم ہے کہ ایک نظریہ، نظام، تحریک اور قائدانہ شخصیت اپنا معیار خیر و شر اپنے ساتھ لائے اور

سرے سے اس کے بھلے برے کے پیمانے ہی آپ سے الگ ہوں۔ لہٰذا سب سے پہلے تو معیار اور پیمانوں کو بالمقابل دیکھ کر جانچنا چاہیے اور معیار اور پیمانوں کو جانچنے سے قبل اساسی نظریہ کی قدر و قیمت مشخص ہونی چاہیے۔

قرآن، اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو لٹریچر ارباب کلیسا اور مستشرق مورخین نے اب تک پیدا کیا ہے وہ ایک طرف غلط فہمیوں اور جہالتوں سے بھرا پڑا ہے اور دوسری طرف معاندانہ تعصب کا زہر اس کی رگ رگ میں پھیلا ہوا ہے بلکہ حد یہ ہے کہ جن لوگوں نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعترافِ حقیقت کیا بھی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر تعریفی انداز تک اختیار کیا ہے انہوں نے بھی ایسے ایسے میٹھے ڈنک سحر آگیں الفاظ کے پردوں میں رکھ دیئے ہیں کہ آدمی فریبِ نگارش کے اس انداز کی داد دیتا رہ جاتا ہے۔ دو چار درخشاں مثالیں ایسی ضرور ملتی ہیں کہ جنہوں نے حضورؐ کے پیغام اور کارنامے کو دلی اعتراف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مگر وہ خود انہیں مغرب کے دل و دماغ نے کچھ زیادہ قدر و قیمت دی نہیں۔ مثلاً حال ہی میں ایک کتاب ذرا بہتر انداز کے ساتھ آئی ہے تو اسے "در مدح مسلمین" (PRO-MOHAMMADEN) قرار دے کر اس کی وقعت گھٹائی جا رہی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ مسلمان مملکتوں سے آج مغرب کی ڈپلومیٹک اغراض وابستہ ہو رہی ہیں ان کے تحت ان اقوام کی تالیفِ قلب کے لیے جانے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں، لیکن کہیں بھی اس ظلم کی تلافی کی فکر نہیں کی گئی جو سرورِ عالم کے ساتھ اب تک روا رکھی گئی ہے۔

تقاضا یہ نہیں کہ آپ ضمیر کی آواز کے خلاف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نظریہ و نظام کی صداقت کی گواہی دیں، نہیں آپ اختلاف کریں اور پورے زور سے کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے اپنے ہی بنائے ہوئے، اپنے ہی تسلیم کردہ اصولوں اور معیارات کو توڑ توڑ کر حقائق کو مسخ نہ کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایسے ماخذ سے روایات نہ لیں جو ایک طرف مسلمانوں کی نگاہ میں بالاتفاق ناقابلِ استناد ہیں اور جنہیں تاریخی تحقیق کے مسلمہ معیارات قبول نہیں کر سکتے۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایک واقعہ کے اچھے محرکات کو ہٹا کر ان کی جگہ دانستہ مکروہ

محرکات لا لا کر نہ رکھیں تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ دلائل سے بات کہیں، طنز و تعریض اور توہین و تذلیل کا غیر شریفانہ ڈھب اختیار نہ کریں۔

اس گفتگو سے ہمارا مدعا ایک ناخوشگوار جذباتی فضا پیدا کرنا نہیں بلکہ اب تک جو فضا موجود رہی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اسے ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے شرطِ اوّل یہ ہے کہ مغرب اسلام قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو صاف کرے۔ ایک نئے ذہن کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے اور وہ نیا ذہن اس کلمۂ سواء یا نقطۂ اشتراک کو سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے جو اہلِ مغرب اور مسلمانوں کے درمیان واقع ہے۔ ہمارا کلمۂ سواء ذیل کے مشترک نکات سے بنتا ہے:

— عیسائی، یہودی اور مسلمان تینوں خدا پرست گروہ ہیں، تینوں کے ہاں آخرت کا تصور موجود ہے، تینوں کی عبادات کا طرز ملتا ہے، تینوں کے نزدیک بنیادی اخلاقی اقدار یکساں ہیں۔

— تینوں کی مذہبی تعلیمات ایک ہی الہامی سرچشمہ سے ماخوذ ہیں اور مسلمان جملہ انبیاء کو ایک ہی عظیم صداقت اور ایک ہی دین کے علمبردار مانتے ہیں۔

تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو اہلِ مغرب اور مسلمانوں کے درمیان ذیل کے نقطہ ہائے اتحاد موجود ہیں:

— مغربی تمدن نے علم اور سائنس کی ترقی کی جو راہیں کھولی ہیں، مسلمانوں کا خالص مذہبی نقطۂ نظر ان ترقیوں کا قدر شناس ہے اور اسلامی نظریاتِ روحانیت کے ساتھ ساتھ اپنے تمدن میں اس مادیت کو جگہ دکھوڑی سی حدود کے ساتھ دے سکتے ہیں جس میں مغرب نے عروج حاصل کیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام دین اور نظام ہونے کی وجہ سے زیادہ وسعتِ ظرف رکھتا ہے۔

— جمہوریت کے جن اصولوں کے ساتھ مغربی تمدن نے سیاسی ہیئتیں استوار کی ہیں پیروانِ اسلام کی نگاہ میں وہ پہلے سے شامل ہیں۔ بلکہ ان کا مکمل ترین مظاہرہ کرنے میں اسلامی تمدن ہی نے سبقت کی ہے۔ نمائندگی وانتخاب، شورائیت، قانون کی عملداری، شہری

لے بریفالٹ اور لیبان کی شہادتیں موجود ہیں کہ جمہوریت کی روح مسلمانوں ہی سے منتقل ہو کر مغرب تک پہنچی

حقوق اور ان میں مساوات کے سارے تصورات کو مسلمانوں نے مغرب سے پہلے جامۂ عمل پہنایا ہے ـــ اگرچہ وقت کے تمدنی و معاشرتی ماحول کی مطابقت میں!

عالمی کھچاؤ اور بحران کو پیش نظر رکھیے تو اس کا حل تلاش کرنے میں بھی دو وجوہ سے مسلمانوں ہی کا تعاون مغرب کے اصلاح پسندوں کے لیے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے :۔

ـــ اگر مغرب سنجیدگی و اخلاص سے سوچے تو امن عالم کے مسئلے میں جتنا تعاون مسلمان بہم پہنچا سکتے ہیں اتنا اور کسی عنصر سے حاصل نہیں ہو سکتا یہی گروہ اعتقاداً اتنی محبتِ انسانیت رکھتا ہے اور جہانی وحدت کے لیے ایسی اصولی بنیادیں رکھتا ہے کہ اگر اسے پوری طرح کام کرنے کا موقع ملے تو بین الانسانی تصادموں کا انسداد ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے عالمی نظام کی تعمیر کے لیے اصول و اقدار کا مسالہ اسلام سے وافر حد تک مل سکتا ہے۔

ـــ مادیت کی دو انتہا پسندانہ اشکال ـــ یعنی سرمایہ پرستی اور کمیونزم ـــ دونوں کا مقابلہ کرنے اور ایک درمیانی راہِ عدل پر انسانیت کو لانے کے کام میں اسلام اور اس کے پیرؤوں ہی سے کچھ زیادہ امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

غور و فکر کے لیے یہ مشترک نکات سامنے رکھ کر ہم کہتے ہیں کہ کیوں نہ اہلِ مغرب اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بدلیں۔ کیوں نہ وہ پادریوں اور مستشرقین کے حائل کردہ پردہ ہائے تعصبات کو پارہ پارہ کر دیں۔ آج جبکہ ایک طرف مادی نظریہ کا تجربہ دل کھول کر کیا جا چکا ہے اور اب اس تجربہ کو اسی ڈھب سے آگے جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ پھر یہ شاخسارِ حکمت اب نئی کونپلیں بھی نہیں چھوڑ رہا ہے جن کو مرکزِ امید بنا کر کچھ اور وقت گذارا جا سکے، دوسری طرف جو مذاہب موجود ہیں ان میں سے ہر ایک فرد کی زندگی کے ایک گوشے میں سکڑ کر رہنا پسند کرتا ہے مگر آگے بڑھ کر زمامِ تمدن ہاتھ میں لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ گویا ہم نظریاتی لحاظ سے ساری پونجی ختم کر کے بالکل دیوالیہ ہوئے کھڑے ہیں لے دے کے ایک مرکزِ توجہ باقی ہے جہاں سے شعاعِ امید پھوٹتی ہے۔ اس کے لیے بھی اگر دلوں کے دروازے بند

کر لیے جائیں تو آخر مریخ سے تو کوئی رہنمائی درآمد نہیں کی جا سکتی۔

وقت ہے کہ آپ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تاریخ ساز، ایک محسنِ انسانیت، ایک قائدِ تمدن، اور ایک انسانِ اعظم کی حیثیت سے جانیں۔ جو روشنی وہاں سے ملتی ہے اس کے لیے دل و دماغ کے دریچے کھول دیں۔ یہ ہستی مستحق ہے کہ اسے آپ سائنٹفک طریق سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ چاہیے یہ کہ آپ اسلام کو عیسائیت کے ایک فریقی مذہب کی حیثیت سے نہ لیں بلکہ جمہوریت، اشتراکیت اور دوسری اصولی تحریکوں کی طرح کی ایک تحریک اور زندگی کے ایک تہذیبی نظام کی حیثیت سے لیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تحریک کے قائد اور اس نظام کے موسّس کی حیثیت سے دیکھیں جنہوں نے ایک عظیم اور روشن دورِ تاریخ کا افتتاح کیا۔ اس ہستی کے پیش کردہ اصولوں کو آپ اس لحاظ سے جانچیں کہ وہ ایک جہانی ریاست چلانے کے لیے آج کہاں تک مفید اور ناگزیر ہیں۔ اس کے تیار کردہ نمونۂ انسانیت کا مطالعہ اس مقصد سے کریں کہ یہ نمونہ جوہری دور کی تہذیب کا کل پرزہ بننے کے لیے کس حد تک موزوں ہے۔

آج جبکہ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہمارے سامنے ہے اور دور دور تک کوئی جگنو بھی چمکتا دکھائی نہیں دیتا پیچھے پلٹ کر نظر ڈالتے ہیں تو محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں ایک مشعل جھلملاتی دکھائی دیتی ہے جو گذشتہ پندرہ چودہ صدیوں سے آندھیوں اور طوفانوں کے درمیان ایک ہی شان سے جل رہی ہے۔ کیا محض خود پیدا کردہ تعصبات اور غلط فہمیوں کی بنا پر اس مشعل کی روشنی کو قبول کرنے سے انکار کر دینا اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لینا کوئی اچھا نتیجہ دے سکے گا؟ کیا انسانیت و تہذیب کو اس اندھیرے میں تباہ و برباد ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ خوب سوچ لیجیے کہ حالات ہمارے سامنے کتنا خوفناک چیلنج لیے کھڑے ہیں اور آیا آپ میں اس کا جواب دینے کی سکت موجود ہے (باقی)

عہدِ صحابہؓ کے فقہی اصول

(از محمد معروف دوالیبی ایل ایل ڈی (پیرس یونیورسٹی) شام

کتاب وسنت کی تکمیل | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی رحلت سے تین ماہ پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً ایک لاکھ نفوس جمع ہوئے۔ یہ انبوہِ کثیر آپؐ نے خود طلب فرمایا تھا۔ اس اجتماعِ عظیم کے عین وسط میں، جو عہدِ نبوت میں پہلی بار اتنی بڑی تعداد میں وجود میں آیا تھا، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ یہ آیت قرآن کا آخری ارشاد ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوا اور جس نے صفحاتِ قرآن پر مہرِ اختتام ثبت کر دی۔ بعض صحابہ کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا کہ اس آیت میں صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لیے واپسی کا بلاوا ہے، کیونکہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپؐ کی مہم پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے اور آپ کا فریضۂ رسالت پورا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ اس آیت کے نزول کو ابھی تین ماہ ہی گذرے تھے کہ آپ کی دنیوی زندگی کے ایام مکمل ہو گئے اور اپنے رفیقِ اعلیٰ کے پاس تشریف لے گئے۔ صفحاتِ قرآن پر تو تین ماہ پیشتر ہی مہرِ اختتام لگ چکی تھی لیکن اب صفحاتِ سنت پر بھی خاتمہ کی لکیر کھنچ گئی۔

اجتہادِ صحابہ کی تین بنیادیں | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات مبارک سے شریعت کے دونوں بنیادی ماخذ مکمل ہو گئے اور کسی نئے حکم کے اضافہ کا سوال باقی نہ رہا۔ لیکن لوگ برابر نو بہ نو مسائل اور غیر مالوف حوادث سے دوچار تھے۔ اب ان کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ جدید مسائل و حوادث پر جب انہیں کتاب و سنت سے کوئی نص نہ دستیاب ہو تو بالآخر اجتہاد کی پناہ لیں۔ چنانچہ انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا اور اس باب میں انہوں نے اولاً قرآن و سنت کے مماثل احکام پر اعتماد کیا، ثانیاً احکامِ قرآن و سنت کی رُوح —— جس سے ان کا ذوق و فہم پوری طرح آشنا تھا —— پر استناد کیا۔

اور ثالثاً اس شائع و ذائع نظریے کو مدنظر رکھا کہ : ما رآہ المسلمون حسناً فھو عند اللہ حسن (مسلمان جس چیز کو مستحسن سمجھیں اللہ کے نزدیک بھی وہ مستحسن ہے) اور یہ کہ " ان المصلحۃ حیثما وجدت فثم شرع اللہ " (شریعت الٰہی کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں۔

توسیع اجتہاد کے دو عوامل | الغرض یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت وہ پہلا عامل تھی جس نے اجتہاد کو ایسے مرحلے میں داخل کر دیا جہاں اس کی اہمیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی اور جہاں سابق کی نسبت اُس کا زیادہ سہارا لیا جانے لگا۔ اس عامل کے متصلاً بعد ایک اور عامل نمودار ہوا جس نے اجتہاد کی توسیع و ترقی میں مزید اضافہ کر دیا۔ یہ اسلامی فتوحات کی برق رفتاری تھی جو مشرق سے لے کر مغرب تک قدیم دنیا کے بہت بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لیے چلی آرہی تھی۔ اور جس کے نتیجے میں عربوں کو بکثرت ایسے طرز حیات سے واسطہ پڑ رہا تھا جس کے اقتصادی اور اجتماعی نظام کے بعض پہلو جزیرہ نمائے عرب کے نظام سے مختلف نوعیت کے تھے۔ چنانچہ مسلمان نئے قانونی مسائل و مقدمات سے دوچار ہونے لگے، جن کے بارے میں قرآن و سنت نے صراحتاً یا اشارۃً کوئی رہنمائی نہیں کی تھی۔ اب مسلمانوں کے اہل علم و بصیرت کا فرض تھا کہ وہ شریعت کے واضح احکام سے جدید مسائل کی تخریج کریں اور اجتہاد کے ذریعے سے ان کے شرعی پہلو دریافت کریں۔

اجتہاد کے دائرہ کار میں غیر معمولی پھیلاؤ | جیسا کہ ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اجتہاد اپنے قواعد و اصول کے لحاظ سے بھی اور اپنے دائرۂ عمل کے لحاظ سے بھی محدود پیمانے پر تھا۔ اس کا استعمال شخصی اور انفرادی حقوق سے متجاوز نہیں ہوا۔ بلکہ ان حقوق میں بھی وہ صرف باہمی لین دین کے مسائل ہی میں جاری رہا۔ البتہ عہدِ نبوت کے بعد، عہد صحابہ میں یہ اپنی حدود سے کئی پہلوؤں سے ترقی کر گیا۔ اوّلاً اس کے دائرہ عمل میں تمام شخصی حقوق مثلاً عائلی حقوق، احکام عقود و التزامات (CONTRACTS AND CONDITIONS) اور فوجداری قوانین آئے اور پھر اسی اہتمام و اعتناد کے ساتھ بلکہ اس سے وسیع الاثر اور عظیم الشان صورت کے ساتھ تمام ملکی حقوق مثلاً بنیادی شہری حقوق، قوانینِ نظم مملکت اور بین الاقوامی ضوابط کو اپنے احاطۂ کار

میں لے لیا۔ جونہی کوئی ایسا قضیہ ابھرتا جو ریاستی معاملات سے یا مصلحتِ عامہ سے تعرض کرتا فوراً اجتہاد حرکت میں آتا اور نظامِ قانون میں بکثرت ایسے نئے اصول و مبادی پیش کر دیتا جو مصلحت عامہ کے تحفظ اور ریاست کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہوتے تھے۔

اجتماعی قوانین میں خلفائے راشدین کی بلند نظری | ملکی قوانین کے باب میں خلفائے راشدین نے ایسے مثالی کارنامے سرانجام دیئے ہیں جو انسانی تاریخ کا نقشِ دوام بن چکے ہیں اور جن کے چرچوں سے ہر دَور گونجتا رہے گا۔ ان قوانین میں جو بلند ترین تصور پیش کیا گیا ہے آج ہمیں اس ترقی یافتہ بین الاقوامی سوسائٹی میں بھی کوئی ایسا ذہن نہیں نظر آتا جو اس تصور تک رسائی حاصل کر سکا ہو یا کم از کم اس طرز پر قانون سازی کے لیے اپنے آپ کو اجازت دینے کے لیے تیار ہو۔ مثلاً ان خلفائے کرام نے بنیادی حقوق کے ضمن میں ہر شہری کے لیے سیاست اور اجتماع میں حریت و مساوات کا حق تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اُسے اس قدر مقدس حق گردانا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب اسی حق کے متعلق ایک مقدمہ آیا تو آپ نے فرمایا: "منذ کم استعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارا" (تم نے کب سے انسانوں کو غلام بنانا شروع کیا ہے حالانکہ اُن کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تنہا یہی قول بنیادی حقوق کے موضوع پر ایک حیرت انگیز مثال کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور انسانی مساوات کی تاریخ میں اس پر مہرِ دوام ثبت ہو چکی ہے۔

عہدِ صحابہ کے مجتہدین اور اہلِ فتویٰ | صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے اہلِ فتویٰ حضرات کی بہت بڑی تعداد نے شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں سے بعض حضرات وہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی مصاحبت اور آپ سے احکامِ دین کے اخذ کرنے میں شہرت رکھتے ہیں، اسی لیے وہ فتویٰ طلب کرنے والوں کا مرجع اور اربابِ قضایا کا مرکز بنے رہے ہیں۔ اہلِ فتویٰ صحابہ کی مجموعی تعداد ایک سو تیس کے قریب ہے جس میں مرد اور عورتیں اور کثیر الفتویٰ، متوسط الفتویٰ اور قلیل الفتویٰ سبھی شامل ہیں۔[1]

[1] اعلام الموقعین از ابن قیم، جزاوّل، ص ۱۳۔ مطبعۃ النیل، مصر

اس پوری تعداد میں سے سات حضرات سرِفہرست ہیں :

۱۔ حضرت عمر بن خطاب، جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ثانی ہیں۔

۲۔ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، جو آپ کے چچازاد بھائی اور داماد اور آپ کے چوتھے خلیفہ ہیں۔

۳۔ امّ المومنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، رسولِ خدا کی زوجہ مطہرہ۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، جو کوفہ میں فقہ کے معلّم اوّل کہلاتے ہیں اور جن کی جانب عراق کے اہل الرائے گروہ کا مسلک منسوب ہے۔

۵۔ حضرت زید بن ثابت، جو قوانینِ وراثت کے اسپیشلسٹ شمار ہوتے ہیں۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، رسولِ اکرمؐ کے چچیرے بھائی

۷۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔

ابو محمد بن حزم فرماتے ہیں: "فقہائے سبعہ کے فتاوی سے ایک ضخیم دفتر جمع کیا جا سکتا ہے انہی کا بیان ہے کہ ابوبکر محمد بن موسیٰ ابن یعقوب بن امیر المومنین المامون نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے فتاوی کو جمع کیا تو ان کی بیس جلدیں تیار ہوئیں"[1]

فقہائے سبعہ کے بعد ذیل کے بیس صحابہ کا نمبر آتا ہے جو متوسط الفتویٰ ہیں۔

۱۔ ابوبکر صدیقؓ ۲۔ ام سلمہؓ زوجہ رسول مقبول، ۳۔ انس بن مالکؓ، ۴۔ ابو سعید خدری ۵۔ ابوہریرہؓ ۶۔ عثمان بن عفانؓ، ۷۔ عبداللہ بن عمرو ابن العاص، ۸۔ عبداللہ ابن الزبیرؓ، ۹۔ ابوموسیٰ اشعری، ۱۰۔ سعد بن ابی وقاص، ۱۱۔ سلمان فارسیؓ، ۱۲۔ جابر بن عبداللہؓ ۱۳۔ معاذ بن جبلؓ، ۱۴۔ طلحہؓ ۱۵۔ زبیرؓ، ۱۶۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ۱۷۔ عمران ابن حصینؓ، ۱۸۔ ابوبکرہؓ، ۱۹۔ عبادہ بن الصامتؓ ۲۰۔ معاویہ بن ابی سفیان۔

ان حضرات میں سے ہر ایک کے فتاوی سے ایک چھوٹا سا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے[2]

---

[1] اعلام الموقعین از ابن قیم ج ۱ ص ۱۳ [2] ایضاً

ان کے بعد باقی تمام صحابہ تیسرے درجے پر آتے ہیں۔ ان سے بہت کم فتاویٰ مروی ہیں۔ حتیٰ کہ ان تمام حضرات کے فتاویٰ کو بھی اگر جمع کیا جائے تو ایک نہایت مختصر سا مجموعہ تیار ہوگا۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ، ام المومنین حضرت صفیہؓ، فاطمہؓ بنت رسول اللہؐ اسی زمرے میں شامل ہیں۔

صحابہ کا طریقِ افتاء و اجتہاد | صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقِ افتاء و اجتہاد نہایت واضح اور سیدھا سادہ اور ان ہدایات پر مبنی تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف روانہ کرتے وقت فرمائی تھیں۔ صحابہ نے اس طریقہ کی کس قدر شدت سے پابندی کی۔ اس کی تفصیل ذیل کے مختلف بیانات سے معلوم ہو سکتی ہے۔

خلیفۂ اوّل کا طرزِ عمل | اس بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جب آپ کے پاس کوئی معاملہ آتا تو اس کا فیصلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے کتاب اللہ میں غور کرتے۔ اگر کتاب اللہ میں حکم مل جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے، اگر کتاب اللہ میں اس کا کوئی حکم نہ ملتا تو سنّتِ نبوی میں غور کرتے۔ اور وہاں حکم مل جاتا تو اُسے مدارِ فیصلہ بنا لیتے۔ اگر ان دونوں سرچشموں میں اس کی رہنمائی نہ ملتی تو عام مسلمانوں سے دریافت فرماتے کہ کیا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں کوئی فیصلہ صادر فرمایا ہو! بسا اوقات متعدد لوگ آپ کے پاس آتے اور بتاتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں اس طرح فیصلہ فرمایا تھا۔ اگر اس کے بعد بھی رسولِ خدا کا کوئی فیصلہ یا رہنمائی دستیاب نہ ہوتی تو آپ سرکردہ اصحاب کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ کرتے۔ اور جس رائے پر ان سب کا اتفاق ہو جاتا اُسی کے مطابق فیصلہ نافذ کر دیتے[1]

خلیفۂ دوم کا طرزِ عمل | یہی طریقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا[2] آپ کتاب و سنّت سے کسی حکم کو نہ پاتے تو زیرِ بحث قضیہ میں حضرت ابوبکرؓ کا کوئی فیصلہ لوگوں سے دریافت کرتے۔ اگر انہیں حضرت ابوبکرؓ کی کوئی نظیر مل جاتی تو اُسی کو اپنے فیصلے کی بنیاد بنا لیتے ورنہ ان لوگوں میں سے اہلِ علم افراد کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ لیتے۔ اور جس رائے پر وہ متفق ہو جاتے، اسی کو بنائے حکم قرار دیتے۔ یعنی حضرت عمرؓ نے

نئی چیز یہ اختیار کی کہ آپ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے فیصلوں کی جانب رجوع کرتے تھے اور اس کے بعد مشورہ اور اجتہاد کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار قاضی شُریح کو لکھا: جب تمہارے سامنے کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس میں رائے دینا ناگزیر ہو تو سب سے پہلے کتاب اللہ میں اس کا حکم تلاش کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق اُسے طے کرو۔ اگر سنتِ نبویؐ بھی خاموش ہو تو صالحین اور ائمہ عدل نے جو فیصلے کیے ہوں اُن کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر تمہیں اختیار ہے کہ اگر اپنی رائے سے (فیصلہ تک پہنچنے کی) کوشش کرنا چاہو تو یہ بھی کر سکتے ہو اور اگر مجھ سے مشورہ لینا چاہو تو میں اس میں تمہارے لیے خیر ہی دیکھتا ہوں"۔

اس بارے میں عبداللہ بن مسعود کی تصریح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسی طریقے کی تائید میں فرمایا کرتے تھے: "تم میں سے جس کے سامنے کوئی معاملہ فیصلے کے لیے پیش ہو تو اُسے چاہیے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور اگر ایسا کوئی معاملہ آجائے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو اس کا فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق کرے اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ اس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو تو صالحین نے اس کا جو فیصلہ کیا ہو اس کی پیروی کرے۔ لیکن اگر ایک معاملہ ایسا آجاتا ہے جو نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں، اور نہ صالحین نے اس سے پہلے کبھی اس کا فیصلہ کیا ہو تو اپنی رائے سے (حق و صواب تک پہنچنے کی) پوری کوشش کرے۔ اگر وہ یہ کوشش (اجتہاد) بھی بطریقِ احسن نہ کر سکتا ہو تو اس قضیے سے دستبردار ہو جائے اس میں شرمندگی کی کوئی وجہ نہیں"۔

عبداللہ بن عباس کا عمل اسی طرح کا طرزِ عمل حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی مروی ہے کہ "ان سے کسی چیز کے بارے میں جب شرعی حکم پوچھا جاتا تو اگر کتاب اللہ میں ہوتا تو وہی فرما دیتے اور اگر کتاب اللہ کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوتا تو اسی کو لے لیتے۔ اگر یہ دونوں ماخذ ساکت ہوتے لیکن حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کسی کا فیصلہ موجود ہوتا تو اسی کو اپنے قول کا ماخذ ٹھہرا لیتے

جب کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اور شیخین کی جانب سے کوئی رہنمائی نہ پاتے تب اجتہاد و قیاس کا طریقہ اختیار کرتے۔

اصولِ قضا پر حضرت عمرؓ کا تاریخی ہدایت نامہ | علیٰ ہٰذا القیاس صحابہ کرام میں سے جو حضرات بھی قضاء اور افتاء کی مسند پر سرفراز ہوئے ہیں وہ اپنے قول میں اور اپنے عمل میں اسی مذکورۂ بالا طریقے پر کاربند رہے ہیں۔ ان تمام حضرات کے اقوال و اعمال نقل کرنے کے بجائے ہم یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ مکتوب درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری والیٔ یمن کو تحریر فرمایا تھا۔ خلیفۂ ثانی کا یہ مکتوب ہر دور میں علماء و قضاۃ کے لیے مینارِ ہدایت رہا ہے۔ اور تمام اصولِ قضاء اور شہادت کے ضابطے اسی اصل پر استوار کیے جاتے رہے ہیں۔

امام ابن قیمؒ اعلام الموقعین میں ابو العوام سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعری کو لکھا: اما بعد،

کتاب و سنت قضاء کے ماخذ ہیں | "بے شک قضاء ایک محکم فرض اور واجب الاتباع سنت ہے۔ پس جب کوئی فیصلہ طلب معاملہ تیرے سامنے آئے تو خوب غور و خوض سے کام لے۔ کیونکہ جو فیصلہ ناقابلِ نفاذ ہو اس کے بارے میں منہ سے کچھ کہنا بے سود ہوتا ہے۔"

مساوات | "مجلس عدالت میں، پیشی میں اور اپنے فیصلے میں لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کر تاکہ کوئی ذی وجاہت تجھ سے ناانصافی کا لالچ نہ رکھے اور کوئی کمزور تیری عدل گستری سے مایوس نہ ہو۔"

ثبوت اور قسم | "ثبوت (بینہ) فراہم کرنا مدعی کے ذمہ ہے اور قسم (یمین) فریقِ مخالف پر۔"

شرائط صلح | "مسلمان کے درمیان صلح کرا دینا جائز ہے۔ مگر وہ صلح جائز نہیں ہے جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا دے۔"

غلط اجتہاد سے رجوع | "آج اگر تو کسی مقدمہ کا فیصلہ کر دیتا ہے، اور پھر اس فیصلہ پر

نظرِ ثانی کرتا ہے اور اس میں تجھے (سابق فیصلے کے برخلاف) وجہِ صواب مل جاتی ہے تو یہ وجہِ صواب اختیار کرنے میں تجھے سابق فیصلہ پر اصرار مانع نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ حق کو اولیت حاصل ہے۔ اُسے کوئی چیز باطل نہیں کرسکتی۔ پس حق کی جانب مراجعت کرلینا باطل میں ڈھکتے رہنے سے بہتر ہے۔"

ضابطۂ شہادت | "تمام مسلمان عدل ہیں۔ باہم گواہی دے سکتے ہیں۔ مگر اُس شخص کی گواہی نہیں قبول کی جائے گی جس سے پہلے جھوٹی گواہی کا تجربہ ہو چکا ہو، یا اُس پر کسی حد کا نفاذ ہو چکا ہو، یا اس کے بارے میں یہ گمان ہو کہ وہ گواہی میں رشتہ داری یا دوستی کا لحاظ کر جاتے گا۔"

عدلیہ کی دخل اندازی کی شرائط | "اللہ تعالیٰ نے بندوں کے پوشیدہ رازوں کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ حدود کے واجب کر دینے والے جرائم) پر اُس نے پردہ ڈالا ہوا ہے۔ یہ پردہ ثبوت اور یمین کے ذریعے ہی اٹھایا جاسکتا ہے۔"

قیاس اور رائے کی اجازت | "اگر کوئی ایسا مقدمہ تیرے سامنے آئے جس کے بارے میں قرآن اور سنت میں رہنمائی نہ ملتی ہو تو اس میں خوب غور و فکر کر، اس سے ملتے جلتے منصوص احکام تلاش کر کے ان پر قیاس کر اور اسی پہلو کو اختیار کر جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور حق سے زیادہ قریب نظر آئے۔"

مجلسِ عدالت میں قاضی کے فرائض | "مقدمہ کے وقت غیظ و غضب، قلق (ایسی برافروختگی جو انسان پر صحیح فیصلہ تک پہنچنے کا دروازہ بند کر دیتی ہے) اور اکتاہٹ سے احتراز کر، لوگوں سے تنگ دل نہ ہو، ناپسندیدگی کا اظہار نہ کر۔ بے شک ایسے مواقع پر قضا کا کام سرانجام دینا جہاں حق تقاضا کر رہا ہو (یعنی ایسے مقدمات میں جن میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہوتا ہو) اللہ کے نزدیک اجر کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ اور نیک نامی بھی حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص بہ نیتِ خالص امرِ حق اختیار کرتا ہے، چاہے اُس کی زد اُس کے

اپنے اوپر پڑتی ہو، تو خلقِ خدا کے ساتھ اُس کا جن معاملات میں سابقہ درپیش ہے اُن میں اللہ تعالیٰ اُس کی مدد کرتا ہے۔ جو شخص جھوٹی زینت اختیار کرے گا اللہ اسے بدنما کریگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے خالص اور بے آمیزش اعمال کے ماسوا کوئی عمل قبول نہیں فرماتا۔ کجا یہ کہ تو (غیر خالص اور ریاکارانہ اعمال پر) (دنیا میں) نقد روزی اور (آخرت میں) رحمت کے بے پایاں خزانوں کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے ثواب کا خیال باندھے۔ والسلام"

اجتہاد کی تین قسمیں | الغرض اسی مذکورہ طریقہ کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تلامذہ کرام فتاویٰ جاری کرتے تھے اور مقدمات کا تصفیہ کرتے تھے اور پیش آمدہ مسائل میں قیاس و اجتہاد کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔ اجتہاداتِ صحابہ کا جب ہم تتبع اور استقرا کرتے ہیں تو ان کے تمام اجتہادات ہمیں تین قسموں پر مشتمل نظر آتے ہیں:

اوّلاً ــــ کتاب و سنت کے احکام کی تعبیر۔

ثانیاً ــــ کتاب و سنّت کے مماثل اور متشابہ احکام پر ان کا قیاس۔

ثالثاً ــــ رائے ــــ جو کسی ایک مخصوص نص پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کا مدار پورے نظام شریعت میں جاری و ساری رُوح پر ہے۔ اور وہ روح عبارت ہے ان اصولوں سے کہ "مصلحت ہی منشائے شریعت ہے" ــــ "مصلحت کا جو تقاضا ہوگا شریعتِ الٰہی کا وہی منشاء ہوگا" ــــ "مسلمانوں کے نزدیک جو مستحسن ہے اللہ کے نزدیک بھی مستحسن ہے"۔

تین قسموں کی مثالیں | چنانچہ ہم ذیل میں اجتہاد کی اقسام سہ گانہ کی مزید وضاحت کے لیے اور قاری کو صحابہ کے طرزِ اجتہاد سے متعلق صحیح نقطۂ نظر سے روشناس کرانے کے لیے تینوں طریقوں کی ایک ایک مثال درج کرتے ہیں۔ ان مثالوں میں قاری کو معلوم ہوگا کہ اُمّتِ مسلمہ کے گروہ اوّل کے فہم و قیاس کا کیا ڈھب تھا۔ اور اپنے اجتہادات میں اُس نے مصلحت جوئی اور منشائے شریعت کی تکمیل میں کس قدر اعتدال اور شدت سے کام لیا ہے۔

قسم اوّل اور قسم ثالث کی جامع مثال | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد، دورِ صحابہ میں سب سے اہم اور نمایاں جو اجتہادی مسئلہ پیدا ہوا وہ عراق و شام و مصر کے مفتوح علاقوں کی زمینوں کی تقسیم کا

مسئلہ تھا قرآن کریم کا نہایت صریح حکم ہے کہ مالِ غنیمت کا خمس بیت المال میں جائے گا اور ان مدات میں صرف کیا جاتے گا جن کی تصریح خود قرآن نے کر دی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ	اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل
فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي	کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول
الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ	اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں
السَّبِيلِ (الانفال)	کے لیے ہے۔

باقی چار حصے ان سب لوگوں میں بانٹ دیئے جائیں جنہوں نے جہاد میں حصہ لیا ہے مذکورہ آیت کے مفہوم کا بھی یہی تقاضا ہے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی منقول ہے کہ آپ نے خیبر کے غنائم کو مجاہدین کے اندر تقسیم فرما دیا تھا۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب عراق و شام کے علاقے فتح ہوئے تو وہاں کی زمینوں کی تقسیم کے لیے مجاہدین آپ کے پاس آئے اور مذکورہ قرآنی نص اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تحت آپ سے مطالبہ کیا کہ ان زمینوں میں سے خمس بیت المال اور مذکورہ آیت میں بیان کردہ اغراض کے لیے وضع کر لیا جائے اور باقی ۴/۵ فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو جواب میں فرمایا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں زمین ان لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد کے آنے والے مسلمانوں کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ ہو۔ کیا بعد میں آنے والی نسلیں آکر یہ دیکھیں کہ زمین ایک محدود طبقہ میں تقسیم ہو چکی ہے اور اسی طبقہ میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہو رہی ہے؟ میں اس رائے کو درست نہیں سمجھتا ہوں۔"

خلیفۂ ثانی کا جواب سن کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے فرمایا:

"اور کونسی رائے ہو سکتی ہے؟ یہ مفتوحہ زمین اور اس کے مالک مالِ غنیمت ہی ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے لشکرِ اسلام کو دلوایا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے اپنے خیال کی مزید صراحت کرتے ہوئے عبدالرحمان بن عوف سے فرمایا:

"یہ آپ کا خیال ہو سکتا ہے۔ میں اس خیال کے حق میں نہیں ہوں۔ خدا کی قسم میرے بعد اسلامی فتوحات میں جو علاقہ بھی آئے گا اُس سے اس کثیر مقدار میں مال ہاتھ نہیں لگ سکے گا۔ بلکہ ممکن ہے آئندہ فتوحات مسلمانوں کے لیے مالی بوجھ بنتی رہیں۔ اس لیے اگر میں اراضی شام اور ان کے کاشتکار اور اراضی مصر اور ان کے کاشت کار تمہارے درمیان تقسیم کر دوں تو پھر سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی؟ اور اس علاقے اور اس کے علاوہ شام اور عراق کے یتیم بچوں اور بیواؤں کی کفالت کہاں سے ہو گی؟"

حضرت عمرؓ کے اس جواب پر مطالبہ کرنے والوں نے متعدد اعتراضات کیے اور کہنے لگے "کیا جس مال کو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری تلواروں کے ذریعے سے دیا ہے آپ اُسے ان لوگوں کے لیے، اور ان لوگوں کے بچوں اور پوتوں کے لیے مختص کرنا چاہتے ہیں جو اس وقت موجود نہیں ہیں اور جو جنگ میں شریک نہیں ہوئے ہیں؟ کیا ان کے خیال سے ہماری حق تلفی کرنا چاہتے ہیں؟"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے اعتراضات پر اس کے سوا کچھ نہیں فرماتے تھے کہ ھٰذا رائی (میری رائے یہی ہے)۔ ان لوگوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ اس قضیے میں اہلِ شوریٰ اور عام صحابہؓ سے مشورہ کریں۔ چنانچہ آپ نے اوّلاً مہاجرین سے اس معاملے میں گفتگو فرمائی۔ مہاجرین نے مختلف رائیں دیں (یعنی بعض نے آپ سے اتفاق کیا اور بعض نے اختلاف)۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی رائے یہ تھی کہ جن کی تلواروں نے ملک فتح کیا ہے انہی کو قبضہ کا بھی حق ہے۔ حضرت عثمانؓ، طلحہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کی رائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے موقف کی تائید میں تھی

مہاجرین کے بعد آپ نے مشورہ کے لیے انصار کی جانب رجوع فرمایا اور انصار کے دس ممتاز اور سرکردہ آدمیوں ــــ پانچ قبیلہ اوس میں سے اور پانچ خزرج میں سے ــــ کو بلا بھیجا۔ جس وقت یہ تمام جمع ہوئے، آپ نے حمد و ثنا کے بعد ان کے سامنے یہ تقریر کی:

"میں نے آپ حضرات کو محض اس لیے زحمت دی ہے کہ جس بارِ امانت کو میرے سپرد کیا گیا ہے اور جن معاملات کی ذمہ داری آپ لوگوں نے مجھ پر لادی ہے اس کے اٹھانے میں میری مدد کریں۔ اس لیے کہ میں بھی آپ ہی لوگوں جیسا ایک آدمی ہوں۔ آج آپ لوگوں کو ایک حق بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس فیصلہ میں کچھ لوگوں نے میری مخالفت کی ہے اور کچھ نے موافقت کی ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری مرضی اور خواہش کی اتباع کریں (اور میری خاطر حق بات کو چھوڑ دیں)۔ آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب موجود ہے جو خود حق واضح کر دے گی۔ بخدا! اس بارے میں جو کچھ کہوں گا اس کا مقصود اظہارِ حق کے سوا کچھ نہ ہوگا اور اپنی رائے کو بزور مسلط کرنا میرے پیشِ نظر نہ ہوگا۔"

تمام حاضرین نے بیک زبان ہو کر کہا "امیر المومنین! آپ ارشاد فرمائیے، ہم آپ کی بات کو غور سے سنیں گے۔" چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس تمہید کے بعد فرمایا:

"آپ لوگوں نے سنا ہو گا کہ جو لوگ سوادِ عراق کی تقسیم کے حامی ہیں اُن کا خیال ہے کہ میں ان کے حقوق چھین کر ان پر ظلم کر رہا ہوں۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ کسی کے معاملے میں ظلم کا مرتکب ہوں۔ اگر میں کوئی ایسی چیز، جو ان کی ملکیت میں ہوتی اور جس پر ان کا حق قائم ہوتا، ان سے چھین کر دوسروں کو دے دیتا تو بے شک یہ میری بدبختی ہوتی۔ لیکن اصل صورت یہ ہے کہ میں غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ارضِ کسریٰ فتح ہو جانے کے بعد کوئی ایسا بڑا علاقہ نہیں رہا جس کی فتح سے اموالِ کثیرہ حاصل ہوں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے کسریٰ کے اموال، ان کی زمینیں اور زمینوں کے کاشت کار ہمیں غنیمت میں عطا فرما دیئے ہیں۔ جہاں تک اموال (منقولہ) کا تعلق ہے تو میں نے مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دیئے ہیں۔ ان میں سے خمس نکال لیا ہے اور اُسے مطلوبہ اغراض میں صرف کر دیا ہے۔ اور تا حال صرف کر رہا ہوں، باقی رہیں زمینیں، تو ان کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ (مصالح عامہ اور جہاد وغیرہ

کی خاطر انہیں تقسیم سے روک لوں اور اصل کاشت کاروں کے ہاتھ میں رہنے دوں۔ ان پر فقط جزیہ اور خراج عائد کر دیا جائے تاکہ اس سے جو آمدنی ہو اُس سے فوجیوں، معصوم بچوں اور بعد میں آنے والی نسل سب کو فائدہ پہنچایا جائے۔

"کیا آپ لوگوں نے اس پر غور کیا ہے کہ یہ مملکت اسلامی کی وسیع سرحدیں ہیں، جن کی حفاظت کے لیے ایک مستقل فوج کی ضرورت ہے۔ یہ اسلامی سلطنت کے بڑے بڑے وسیع خطّے اور شہر مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر ہیں۔ ان کے اندر بھی حفاظت کے لیے کثیر تعداد میں فوج متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے تنخواہوں اور وظائف کا انتظام کرنا پڑے گا۔ اگر میں یہ زمینیں ان کے مالکوں سمیت فوجیوں میں تقسیم کر دوں تو اتنی بڑی فوج کے مصارف کہاں سے پورے ہوں گے؟"

یہ تقریر سن کر تمام انصار نے متفقہ طور پر اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا:

"آپ کی رائے بالکل بجا اور آپ نے جو کچھ فرمایا اور جس ضرورت کا احساس کیا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ فی الواقع اگر اسلامی سرحدوں اور اسلامی شہروں کی کثیر افواج سے حفاظت نہ کی گئی اور ان کے لیے حکومت کی طرف سے روزینے جاری نہ کیے گئے تو خدشہ ہے کہ کفار دار الکفر کی طرف رجوع کر جائیں گے۔"

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلسِ عام کے اتفاق سے اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور فرمایا:

"(اللہ کی توفیق سے) میرے فیصلے کی صحت مجھ پر واضح ہو گئی ہے۔ اب ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو سوادِ عراق کی پیمائش کر کے قابلِ زراعت اراضی کا بندوبست کرے اور کاشتکاروں پر ان کے مناسبِ حال لگان تشخیص کرے۔"

لوگوں نے حضرت عثمان بن حنیفؓ کا نام پیش کیا کہ زمین کے معاملات میں انہیں خاصی سوجھ بوجھ ہے اور عملی تجربہ بھی رکھتے ہیں اس لیے اس مہم پر ان کا مقرر کیا جانا مناسب رہے گا۔ حضرت

عمرؓ نے بلا تاخیر حضرت عثمان بن حنیف کو طلب فرمایا اور سوادِ عراق کی پیمائش کا کام ان کے سپرد کر دیا۔

اسی فیصلہ کی اساس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متعدد مقامات کی مفتوحہ اراضی کو فاتحین کی جاگیر میں دینے کے بجائے اصل کاشتکار آبادی کے پاس چھوڑ دیا اور اس کو ذمی بنا کر اس پر خراج نافذ کر دیا۔ چنانچہ شام اور مصر کی زمینوں کے بارے میں یہی اصول اختیار کیا گیا۔ مصر کی زمینوں کے بارے بھی زبیر بن عوامؓ اور عمرو بن العاص امیرِ مصر کے درمیان اسی نوعیت کا تنازعہ برپا ہوا تھا جس طرح کا سوادِ عراق کے بارے میں ہم نقل کر آئے ہیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے وہاں بھی عدمِ تقسیم اور خراج لگانے کا حکم دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ ان کا یہ اجتہاد قرآن و سنّت کے نصوص کا بیان اور تعبیر تھا۔ اور انہوں نے اختلافِ رائے رکھنے والوں پر زور دیا کہ وہ بھی نصوصِ شریعت کو اجتماعی مصلحت ـــــ جو شریعت کا اصل منشا ہے اور جس پر انسانوں کی صلاح و فلاح کا مدار ہے ـــــ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

قاضی ابو یوسفؒ حضرت عمرؓ کے فیصلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیقِ خاص ـــــ سے قرآنِ حکیم کا منشا منکشف فرمایا اور انہوں نے مجاہدین اور فاتحین کے درمیان مفتوحہ اراضی تقسیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا، اسی میں تمام مسلمانوں کی بہتری تھی اور ان کی یہ رائے کہ ایسی زمینوں سے خراج حاصل کر کے اجتماعی ملکیت قرار دے دیا جائے اسلامی جماعت کے عمومی مصالح کی حامل تھی، اس لیے کہ اگر مفتوحہ زمینیں وقفِ عام کر کے کارکنوں کے لیے تنخواہوں اور روزینوں کا انتظام نہ کر لیا جاتا تو نہ تو اسلام کی سرحدوں کی حفاظت ہو سکتی تھی اور نہ سلسلۂ جہاد کو جاری رکھنے کے لیے فوجی قوت حاصل ہو سکتی تھی۔"

اراضیٔ عراق کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی مذکورہ بالا مثال بیک وقت اجتہاد کی دو قسموں پر روشنی ڈالتی ہے۔ ایک قسم اوّل جس میں اجتہاد نصوصِ شریعت کی تفسیر و بیان سے عبارت ہے

اور دوسری قسم ثالث جس میں اجتہاد کی اساس روحِ شریعت پر استوار ہوتی ہے۔

قسم ثانی کی مثال رہا دوسری قسم کا اجتہاد جس میں کتاب و سنت کے نظائر پر نئے احکام قیاس کیا جاتا ہے، تو اس کی مثال توریث جدّہ والے مسئلے میں موجود ہے۔ سنّت میں نانی کا جو حصّہ وارد ہے فقہائے صحابہ نے اُسی پر قیاس کر کے دادی کا حصّہ مقرر کیا ہے، بلکہ دادی کو بطریقِ اولیٰ اس حصّے کا حقدار ٹھہرایا ہے۔

اس کی پوری تفصیل علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں بیان کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"ایک بار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک متوفی کی دادی اور نانی ترکہ کا دعویٰ لے کر آئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے نانی کو تو وراثت میں سے حصّہ دلوا دیا مگر دادی کو محروم کر دیا۔ انصار کے قبیلۂ بنی حارثہ میں سے ایک شخص نے جسے عبدالرحمان بن سہل کہا جاتا تھا، حضرت ابوبکرؓ سے کہا: اے رسولِ خدا کے نائب! آپ نے اسے میراث کا حقدار ٹھہرا دیا ہے جس کے مرنے کے بعد کوئی اس کا وارث نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور میراث میں نانی اور دادی دونوں کو حقدار قرار دیا۔ اس لیے کہ یہ سراسر غیر معقول بات ہے کہ ہم نانی کو تو اس کے نواسوں اور نواسیوں کے ترکہ میں سے حق دلا دیں حالانکہ نواسوں اور نواسیوں کا نانی کے ترکہ میں کوئی حق نہیں ہے۔ اور اُدھر دادی کو ہم پوتوں اور پوتیوں کے ورثے سے محروم کر دیں حالانکہ پوتے اور پوتیاں دادی کے ترکے میں سے حصہ پائیں۔ معقول صورت یہی ہے کہ جب سنت نے نانی کو وارث ٹھہرایا ہے تو اسی پر قیاس کر کے دادی کو بھی ورثاء میں شامل کر دیں — بلکہ دادی کو بطریقِ اولیٰ وراثت میں سے حصّہ پانا چاہیے۔"

مصلحی اجتہاد کی وسعت و اہمیت اجتہاد کا تیسرا طریقہ وہ ہے جو رائے اور قیاس پر استوار ہوتا ہے اور اس میں کسی مخصوص نص کو مدنظر رکھ کر احکام کا استنباط نہیں ہوتا بلکہ پوری شریعت کی روح کو اور عمومی مصلحت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ نظامِ اجتہاد اور قانون سازی میں بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میدان میں اربابِ نظر کے نہایت جلیل القدر کارنامے سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ یہ درست نہ ہوگا

کہ ہم یہ معلوم کیسے بغیر آگے نکل جائیں کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تلامذۂ عظام اور خلفائے کرام کی نظروں میں اس طریقۂ اجتہاد کی کیا قدر و قیمت تھی؟ اور وہ دین کے فہم اور احکام دین میں وقیقہ رسی کا اسے کس حد تک ذریعہ تصور کرتے تھے؟

یہاں ضمناً یہ بھی واضح کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہی طریقۂ اجتہاد بعد کے ادوار میں ان تمام مسائل و احکام پر شامل تھا اور انہیں جنم دینے کا موجب ہوا جو مالکیہ کے نزدیک مصالحِ مرسلہ کے نام سے موسوم تھے اور حنفیہ کے ہاں استحسان کی اصطلاح سے مشہور تھے (تفصیلات آٹھویں اور نویں باب میں آئیں گی)

مصالحِ مُرسلہ سے مراد وہ اجتماعی مصلحتیں (PUBLIC-GOOD) ہیں جن کی رعایت کے لیے اگرچہ کوئی مخصوص نص وارد نہیں، لیکن عمومی طور پر انہیں شریعت نے قانون سازی میں ملحوظ و معتبر رکھا ہے اور ان کا دار و مدار شریعت کے اصولِ عامّہ اور قواعد کلیہ پر ہے جو اس نوعیت کی مصلحتوں کو ملحوظ رکھنے کے متقاضی ہوتے ہیں۔ استحسان یہ ہے کہ مجتہد کسی زیر بحث مسئلہ کو اس کے نظائر کے حکم سے خارج کرکے کسی دوسرے حکم میں داخل کر دیتا ہے، اس عدول کے لیے اس کے سامنے کوئی ایسی قوی تر وجہ ہوتی ہے جو مسئلے کو دوسرے حکم کی طرف راجع کرنے کی متقضی ہوتی ہے۔ اس "قوی تر وجہ" کی تہ میں بھی دراصل ان مصالح کی حمایت مقصود ہوتی ہے جن کی شریعت حمایت کرتی ہے اور اُس منشائے شریعت کی بوجوہ احسن تکمیل ہوتی ہے جسے "مصلحت" کہا جاتا ہے۔

اسلام نے صحابہ کے اندر مصلحتِ انسانی کی حمایت کا جو تصور اور ولولہ پھونک رکھا تھا اس کی وجہ سے اس جلیل القدر گروہ کے ذہن و قلب پر زیادہ تر مصلحی اجتہاد کا غلبہ تھا اور ان کے فہم و ذوق پر اسے غیر معمولی کارفرمائی حاصل تھی۔

مصلحی اجتہاد کی مثالیں چنانچہ ابھی ابھی ہم مفتوحہ اراضی کی تقسیم کے مسئلے میں حضرت عمرؓ اور فاتحین عراق اور ان کے حامی صحابہ کا جو مباحثہ نقل کر کے آئے ہیں وہ مصلحی اجتہاد کی بہترین مثال ہے۔ مجاہدین اور ان کے حامی قرآن کے ظاہری حکم کی بنیاد پر تمام اموالِ غنیمت کو ۴/۵ (فوجیوں کے لیے) اور ۱/۵ (بیت المال کے لیے) کے فارمولے کے تحت تقسیم کر دینے کے حق میں تھے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

ملک کی دفاعی ضرورت کو پیشِ نظر رکھا۔ ان کا خیال تھا کہ دفاع کے لیے مستقل آمدنی کے بغیر چارہ نہیں اور یہ اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب کہ تمام مفتوحہ زمینوں کو بحق بیت المال محفوظ کر لیا جائے۔ اور چونکہ دفاعِ ملک ایک ایسی اجتماعی مصلحت ہے جس کی حفاظت و رعایت ہر دوسری چیز پر فوقیت رکھتی ہے اس لیے آیتِ مذکورہ کا اطلاق اموالِ منقولہ تک محدود رکھا جائے۔ اور غیر منقولہ اموال — اراضی — کو اس کے مفہوم میں شامل نہ سمجھا جائے۔ الغرض یہ پوری بحث اور اس کا انداز اور مصلحت کے تصور پر مبنی رائے ہمارے سامنے مصلحی اجتہاد یا اجتہاد بالرائے کی عمدہ ترین مثال پیش کرتی ہے۔

غیر مناسب نہ ہوگا اگر ہم قارئین کے سامنے اسی طریقۂ اجتہاد کی ایک اور مثال یہاں نقل کر دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض چراگاہیں ان کے مالکوں سے ضبط کر کے انہیں فوج کے گھوڑوں کے لیے وقف کر دیں۔ خلیفۂ راشد کے اس تصرف پر چراگاہوں کے مالک بڑے برافروختہ ہوئے اور حضرت عمرؓ کے پاس آ کر ان کے تصرف پر شدید احتجاج کیا۔ ابو عبید ابن سلام نے کتاب الاموال میں اس واقعہ کی جو روداد نقل کی ہے اس کے مطابق ایک اعرابی نے حضرت عمرؓ کے سامنے ہو کر کہا: امیر المومنین! یہ ہمارے وہ علاقے ہیں جن کی خاطر جاہلیت میں ہمارے درمیان تلوار چلتی رہی ہے۔ اسلام لانے کے بعد بھی یہ علاقے ہمارے پاس رہے۔ اب آپ کس حق کی بنا پر ان کو ہمارے ہاتھ سے چھین رہے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے یہ اعتراض سن کر سر نیچے ڈال لیا اور مونچھوں کو بل دینے اور زور زور سے سانس لینے لگے — حضرت عمرؓ کی عادت تھی کہ جب کسی تکلیف دہ بات سے دوچار ہوتے تو مونچھوں کو بل دینے لگتے اور زور زور سے سانس لینے لگتے — اعرابی نے حضرت عمرؓ کو حالتِ تفکر میں دیکھ کر اپنی بات کو بار بار دہرانا شروع کر دیا۔ بالآخر حضرت عمرؓ نے قرآن یا سنتِ نبوی سے کسی سند کو تلاش کیے بغیر صرف نظریۂ مصلحت پر اعتماد کرتے ہوئے اعرابی کو جواب دیا:

المال مال الله، والعباد عباد الله	یہ سب اللہ کا مال ہے۔ یہ لوگ سب اللہ کے بندے ہیں خدا کی قسم!
والله لولا ما احمل علیه فی سبیل الله	اگر مجھے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے ان کا انتظام نہ کرنا ہوتا تو میں ایک
ما حمیت من الارض شبراً فی شبر	مربع بالشت جگہ بھی سرکاری چراگاہ کے لیے نہ لیتا۔

رسائل و مسائل

نظامِ تعلیم کے متعلق چند بنیادی سوالات

سوال: بندہ درس و تدریس کے کام سے ایک عرصہ سے وابستہ ہے اور آج کل یہاں زیرِ تعلیم ہے یہاں ماہرینِ تعلیم سے اکثر تعلیمی موضوعات پر بحث رہتی ہے۔ چنانچہ شکاگو یونیورسٹی کی فرمائش پر بندہ ایک مقالہ قلم بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ پاکستان کی تعلیمی ضروریات امریکہ اور دیگر ممالک کی ضروریات سے بہت مختلف ہیں۔ پاکستانی ضروریات کا حل اسلام کے بنیادی اصول کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ اگر امریکی طرزِ تعلیم بغیر سوچے اختیار کیا گیا تو ناقابلِ تلافی نقصان ہونے کا خطرہ ہے۔

جناب کی بیشتر تصنیفات میری نظر سے گذر چکی ہیں اور اب رہنمائی کر رہی ہیں۔ ایک دو سوال کچھ اس پیچیدہ نوعیت کے در پیش ہوئے کہ میں نے ضروری سمجھا کہ جناب سے براہ راست رہنمائی حاصل کی جائے۔ امید ہے کہ آپ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود کچھ وقت نکال سکیں گے۔ اپنی گزارشات سلسلہ وار تحریر کرتا ہوں۔

۱۔ جن ملکوں میں صنعتی ترقی ہوئی وہاں لازمی طور پر عام اخلاقی تنزل ہوا۔ ملوں، کارخانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عورت، مرد، بچے تک مشینوں کے پرزے بن گئے۔ ان ملکوں کے نتیجے کے طور پر کچھ مفکر پیدا ہوئے (مثلاً امریکہ میں جان ڈیوی)، جنہوں نے نئی طرز کی زندگی کو نظریاتی سہارا دیا۔ روایات کو غلط قرار دیا۔ اور سوسائٹی کی اقدار ہی کو بدل دیا! پاکستان میں ایک طرف تو صنعتی ترقی ضروری ہے۔ دوسری طرف اسلامی روایات، اور اقدار کو قائم رکھنا فرض ہے۔ براہِ کرم فرمائیے کہ یہ بظاہر

متضاد مقاصد کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟ مشینی فضا میں روح کیسے تازہ رہ سکتی ہے؟ تبدیلیاں لازمی ہیں۔ مگر کس حد تک قابلِ قبول ہیں؟

۲۔ اسلامی تعلیم کس قسم کی ہو؟ کیا سب کے لیے ہو؟ فری ہو یا نہ ہو؟ ۔ وہ نمونے کی شخصیت جو سکول کو پیدا کرنی چاہیے اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا ہمارے دینی مدارس ایسی شخصیتیں پیدا کر رہے ہیں؟

۳۔ نمونے کی اسلامی گھریلو زندگی کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا موجودہ گھریلو زندگی اسلامی ہے؟ کیا شہر اور گاؤں میں ایک طرز کی گھریلو زندگی ہوگی؟ ۔۔۔ موجودہ گھریلو زندگی میں پرانی ہندوستانی روایات کا کتنا دخل ہے؟

جواب: یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ آج کل امریکہ میں فنِ تعلیم کی تحصیل مزید کر رہے ہیں۔ جن موضوعات کا آپ نے اپنے عنایت نامے میں ذکر کیا ہے وہ فی الواقع بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق مختصراً اپنے خیالات عرض کیے دیتا ہوں۔

انسانی تمدن میں مادی تغیرات کی مثال ان تغیرات کی سی ہے جو فردِ انسانی کے جسم میں بچپن سے جوانی، جوانی سے کہولت اور کہولت سے بڑھاپے کی طرف منتقل ہوتے وقت رونما ہوتے ہیں۔ ان کا روح اور نفس سے گہرا تعلق ضرور ہے، مگر ان تغیرات کے نتائج کا کوئی ایسا متعین اور قطعی ٹھپہ نہیں ہے جو تمام انسانوں کے نفس پر ہمیشہ یکسانیت کے ساتھ لگتا ہو بلکہ ان میں فرد فرد کے لحاظ سے بھی، اور انسانی جماعتوں کے لحاظ سے بھی بڑا فرق ہوتا ہے جس میں بہت سے دوسرے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر تعلیم، تربیت اور معاشرتی ڈھانچہ جو کسی فردِ انسانی کو میسر آئے، ایسا صالح ہو کہ فرد کو ارتقاءِ حیات کی طرف لے جانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک عمدہ اور مضبوط سیرت کو بھی اس کے اندر نشوونما دیتا ہے تو بچپن سے جوانی کی عمر میں داخل ہوتے وقت اس کی طبیعت کی جولانی غلط راہوں پر جانے کے بجائے بہترین تعمیری راہیں اختیار کرتی ہے اور یہی ارتقاء بڑھاپے تک صحیح طریقے سے بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن اگر تعلیم کسی صحیح فکر کو نشوونما دینے والے فلسفے پر مبنی نہ ہو، اور تربیت بھی غلط عادات و خصائل

پیدا کرنے والی ہو اور پھر معاشرتی ڈھانچہ بھی بگاڑنے والا ہی میسر آئے تو ایک بچہ آغازِ ہوش ہی سے مجرم بننا شروع ہوتا ہے، جوان ہو کر چور اور ڈاکو بن کر اٹھتا ہے اور بڑھاپے تک اس کی جرائم پیشگی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی تمدن میں جو مادی تغیر مثلاً صنعتی انقلاب سے رونما ہوا، اس میں بجائے خود کوئی خرابی نہ تھی۔ اس میں انسان کی بھلائی ہی کا سامان تھا، جیسا کہ جوانی کا آنا بجائے خود کوئی برائی نہیں بلکہ انسان کے لیے اپنی ذات میں رحمت ہی ہے۔ لیکن قصور اس فلسفۂ حیات کا تھا جو سولھویں سترھویں صدی سے یورپ میں نشو و نما پا رہا تھا۔ اس نے ذہن کو بگاڑا، ذہن کے بگاڑ نے اخلاق خراب کیے، اور اخلاق کی خرابی نے معاشرتی ڈھانچے کو، جو دورِ جاگیرداری سے بگڑا ہوا چلا آ رہا تھا اور زیادہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس حالت میں صنعتی انقلاب کی طاقت میسر آ جانے سے قومیں کی قومیں جرائم پیشہ بن گئیں اور اب ایٹم کی طاقت پا کر تہذیب کی ساری نمائشوں کے باوجود اسفل السافلین کی طرف جا رہی ہیں۔ اس حالت میں جو فلاسفہ لوگوں کو اس بگاڑ پر مطمئن کرنے کے لیے نئے نئے نظریاتی سہارے دیتے ہیں اور بگڑے ہوئے سانچے سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے سوسائٹی کی اقدار بدلنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی مثال اس دشمنِ دوست نما کی سی ہے جو ایک بگڑتے ہوئے بچے کو پہلی مرتبہ جیب کاٹنے پر شاباش کہے اور اسے یقین دلائے کہ یہ جیب تراشی تو ایک بہترین آرٹ ہے جس کی مذمت کرنے والے لوگ محض دقیانوسی ہیں۔

میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ مادی ترقی کے مقاصد اور اسلامی اقدار کے مقاصد میں کوئی حقیقی تضاد ہے۔ نہ میں یہ مانتا ہوں کہ یورپ میں صنعتی ترقی کے ساتھ جس مخصوص تمدن و تہذیب نے نشو و نما پایا ہے یہ صنعتی ترقی سے کوئی جوہری تلازم رکھتا ہے اور لازماً جب اور جہاں بھی یہ ترقی ہوگی وہاں یہی تہذیب ظہور میں آئے گی یا آنی چاہیے۔ اسی طرح یہ مفروضہ بھی میرے لیے قابلِ قبول نہیں ہے کہ انسانی روح چرخے اور چاک اور چکی کے ساتھ تو تازہ رہ سکتی تھی مگر مشین ہی کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ اس سے سابقہ پیش آتے ہی اس روح پر مُردنی چھا جائے۔ میرے نزدیک ایک صحیح فلسفۂ حیات سے اگر ذہن درست کیے جائیں، ایک صالح نظامِ اخلاق اگر سیرت گری کے لیے استعمال

کیا جائے، اور ایک معتدل و متوازن معاشرتی ڈھانچہ انسانوں کو سنبھالنے کے لیے موجود ہو تو صنعتی ارتقاء اور سائنس سے حاصل ہونے والی قوتوں کا استعمال موجودہ مغربی تمدن و تہذیب سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ایک دوسرے تمدن و تہذیب کو نشو و نما دے سکتا ہے، جو اس سے بدرجہا زیادہ طاقت ور بھی ہو اور پھر انسانیت کے لیے باعث رحمت بھی مجھے یقین ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہمیں اس طرح کا فلسفۂ حیات اور نظام اخلاق دے سکتا ہے اور اس کی رہنمائی عملاً قبول کر کے اگر ہم اس کی ہدایات کے مطابق اپنا نظام تعلیم و تربیتِ عامہ، اور اپنا معاشرتی ڈھانچہ بنا لیں تو ان شرائط کی تکمیل ہو سکتی ہے جو اوپر میں نے مادی ترقی کے ساتھ ایک صالح تہذیب کی تشکیل کے لیے بیان کی ہیں۔ اس معاملے میں یہودیت پہلے ہی مایوس کن تھی، عیسائیت نئے دور کے آغاز ہی میں ناکام ثابت ہوگئی، اور بودھ مت سرے سے اس میدان کا مرد تھا ہی نہیں۔ رہے جدید مذاہب، سوشلزم، فاشزم اور کیپٹلزم، سو وہ اپنے تمام عیوب و محاسن کھول کر سامنے لا چکے ہیں اور دنیا خوب دیکھ چکی ہے کہ ان کے محاسن کو ان کے عیوب سے کیا نسبت ہے۔ نیا کوئی فلسفہ بھی اب تک ایسا سامنے نہیں آیا ہے جو ایک تہذیب کی بنیاد بننے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس کو سوچنے والے تمام تر اہلِ مغرب ہیں اور وہ اپنی اس تہذیب کے زہریلے پن سے تنگ آنے کے باوجود اس کی بنیادوں میں تغیر کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے ذہن اس کے حدود سے آزاد ہو کر سوچنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ صرف جزوی ترمیمات سے کام چلانا چاہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی تجویز کردہ ترمیمیں مزید بگاڑ ہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔

اس مختصر خط میں میرے لیے وہ وجوہ بیان کرنا مشکل ہے جن کی بنا پر میں اس معاملہ میں اسلام کو علی وجہ البصیرت کافی ہی نہیں بلکہ انسانیت کے لیے ایک ہی شارع امید سمجھتا ہوں۔ ان دلائل کے اعادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں انہیں اپنی متعدد کتابوں میں بیان کر چکا ہوں۔ مثلاً اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم وغیرہ۔ اس کے علاوہ میرے بہت سے مضامین میں بھی اس کی طرف اشارات موجود ہیں۔

آپ کے دوسرے سوالات کا جواب یہ ہے کہ اسلامی تعلیم اس دور کے لیے جس طرز پر دی جانی چاہیے اسے میں نے اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب تعلیمات میں بیان کیا ہے۔ آپ اسے ملاحظہ فرمالیں۔ میرے نزدیک یہ تعلیم ہر بچے کو ملنی چاہیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، البتہ اس کے مدارج میں صلاحیتوں کے لحاظ سے فرق کیا جانا چاہیے۔ اس کو ابتدائی حد تک جبری اور کم از کم ثانوی حد تک سب کے لیے بالکل مفت ہونا چاہیے، اور آگے کے مدارج میں خاص صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کی کفالت بھی ریاست کو کرنی چاہیے۔ جو نمونے کی شخصیت ایک مدرسے کو پیدا کرنی چاہیے اس کی خصوصیات صرف چار اسلامی اصطلاحوں میں بیان کی جا سکتی ہیں: مومن ہو، مسلم ہو، متقی ہو اور محسن ہو۔ ان اصطلاحوں کو آپ جتنے زیادہ وسیع معنوں میں لیں گے شخص مطلوب اتنا ہی زیادہ جامع کمالات ہوگا۔ تنگ معنوں میں لیں تو صنعتی ترقی کی باتیں اور اس ترقی میں موجودہ تہذیب و تمدن کے فاسق و فاجر کھلاڑیوں سے مسابقت کا خیال چھوڑ دیں، پھر ان شاء اللہ پاکستان و ہندوستان کی ہر مذہبی درس گاہ میں آپ کو نمونے مل جائیں گے۔

ہماری گھریلو زندگی کی بنیادی خصوصیات اسلام کی رو سے چار ہیں: ایک تحفظِ نسب، جس کی خاطر زنا کو حرام اور جرم قابل تعزیر قرار دیا گیا ہے، پردے کے حدود قائم کیے گئے ہیں اور زن و مرد کے تعلق کو صرف جائز قانونی صورتوں تک محدود کر دیا گیا ہے جن سے تجاوز کا اسلام کسی حال میں بھی روادار نہیں ہے۔ دوسرے تحفظِ نظامِ عائلہ جس کے لیے مرد کو گھر کا قوام بنایا گیا ہے، بیوی اور اولاد کو اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اولاد پر خدا کے بعد والدین کا حق سب سے زیادہ رکھا گیا ہے۔ تیسرے حسنِ معاشرت جس کی خاطر زن و مرد کے حقوق معین کر دیے گئے ہیں، مرد کو طلاق کے اور عورت کو خلع کے اور عدالتوں کو تفریق کے اختیارات دیے گئے ہیں، اور الگ ہونے والے مرد و زن کے نکاحِ ثانی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے تاکہ زوجین یا تو حسنِ سلوک کے ساتھ رہیں، یا اگر باہم نباہ نہ سکتے ہوں تو بغیر کسی خرابی کے الگ ہو کر دوسرا بہتر خاندان بنا سکیں۔ چوتھے صلہ رحمی جس سے مقصود رشتہ داروں کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنانا ہے اور اس غرض کے

لیے ہر انسان پر اجنبیوں کی بہ نسبت اس کے رشتہ داروں کے حقوق مقدم رکھے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس بہترین نظامِ عائلہ کی قدر نہ پہچانی اور اس کی خصوصیات سے بہت کچھ دُور ہٹ گئے ہیں اس نظامِ عائلہ کے اصولوں میں شہری اور دیہاتی کے لیے کوئی فرق نہیں ہے، رہے طرزِ زندگی کے مظاہر تو وہ ظاہر ہے کہ شہروں میں بھی یکساں نہیں ہو سکتے، کجا کہ شہریوں اور دیہاتیوں کے درمیان کوئی یکسانیت ہو سکے۔ فطری اسباب سے ان میں جو فرق بھی ہو وہ اسلام کے خلاف نہیں ہے بشرطیکہ بنیادی اصولوں میں ردو بدل نہ ہو۔

چھوٹے ہوئے فرائضِ شرعیہ کی قضا کا مسئلہ

سوال۔ گذشتہ ترجمان القرآن کے رسائل و مسائل میں ایک سوال کے جواب میں چھوٹی ہوئی نمازوں اور دیگر فرائضِ شرعیہ کی قضا کے بارے میں آپ نے لکھا ہے: "ان کی قضا کا آسان طریقہ یہ ہے کہ فرض نمازوں کے بعد جو سنتیں عموماً پڑھی جاتی ہیں انہیں چھوٹے ہوئے فرضوں کی قضا کی نیت کر کے پڑھا جائے تو اس طرح آسانی سے آدمی اس قرض سے سبکدوش ہو سکتا ہے۔"

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فی الواقعہ اس طرح سے چھوٹے ہوئے فرائض کی قضا لازماً ہر اُس شخص کو دینی پڑے گی جس نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ جاہلیت کی حالت میں گزارا ہے؟ ظاہر ہے کہ سائل کا منشا اُن فرائضِ شرعیہ کی قضا کے متعلق تو دریافت کرنا نہیں ہے جو کسی عذرِ شرعی کی بنا پر آدمی سے چھوٹ جاتے ہیں بلکہ اُن فرائض سے ہے جن سے وہ دیدہ دانستہ اور محض بے عملی کی وجہ سے ایک مدت (پانچ، دس، بیس، تیس سال) تک غفلت اور بے پروائی برتتا رہا ہے۔ اب اگر وہ پورے عزم و استقلال کے ساتھ اپنی سابقہ زندگی سے تائب ہو کر آئندہ اپنی زندگی کو شریعت کے مطابق بسر کرنے کا عہد کرتا ہے اور فرائضِ شرعیہ کی پوری پوری پابندی کرتا ہے تو کیا سابقہ زندگی کے متروکہ فرائض کی قضا بھی اُسے لازماً دینی ہوگی؟

کیا توبہ اس کے سابقہ گناہوں کی تلافی نہیں کر سکے گی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر توبہ کا مصرف کیا ہے؟ سورۂ مریم کی اس آیت سے تو صاف طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولٰٓئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا۔ یہی نہیں بلکہ قرآن پاک کی اکثر دوسری آیات اور احادیث نبویہ سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ "التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ" ان آیات و احادیث کی روشنی میں آپ کے ارشادات کی کیا توجیہ ہوگی؟

آپ نے ان فرائض شرعیہ کی قضا کے متعلق جو طریقہ تجویز کیا ہے اگر انسان اس پر عمل کرنا چاہے تو اس میں بھی کئی طرح کی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ سنتیں پڑھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فرضوں کی بجا آوری میں آدمی سے جو کوتاہیاں ہو جاتی ہیں ان کی تلافی سنتیں اور نوافل پوری کر سکیں۔ اب اگر سابقہ زندگی کی چھوٹی ہوئی فرض نمازوں کی قضا دیتے ہوئے سنتیں اور نوافل پڑھنے کا موقعہ آدمی نہ پا سکے تو اس کی تمام نمازیں ادھوری رہ جائیں گی یہی معاملہ روزوں اور زکوٰۃ وغیرہ کا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے بلوغت کے بعد اپنی عمر کے بیس پچیس سال حالت جاہلیت میں گزارے ہیں وہ اگر آپ کے تجویز کردہ طریقے کے مطابق ان کی قضا دینا بھی چاہے تو نہ وہ اس سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ اس پر مطمئن ہو سکے گا۔ اور پھر یہ بھی تو معلوم نہیں کہ اس کی بقیہ زندگی کتنی رہ گئی ہے؟

میرے خیال میں اس مسئلے کا تعلق قریب قریب ہر مسلمان سے ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کے پیش نظر عوام تو ایک طرف رہے، بڑے بڑے دیندار گھرانوں کی نئی نسلیں بھی اسی بے عملی میں مبتلا ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا عزم کرے تو آپ کے اس جواب سے اس پر بددلی اور مایوسی طاری ہو سکتی ہے۔ براہ کرم اس کی مزید وضاحت فرما کر مشکور فرما دیں۔

اس سلسلے میں ایک سوال میں اپنے متعلق بھی آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میری اہلیہ سنہ ۵۰ء میں تپ دق میں مبتلا ہوگئی تھی۔ چونکہ وہ ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے بچپن ہی سے صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرتی رہی ہے۔ تقریباً سات سال تک اس مرض میں مبتلا رہنے کے بعد اب دو تین سال سے روبصحت ہے اور اپنے آپ کو اس قابل سمجھتی ہے کہ رمضان کے روزے رکھ سکے گی۔ اگر میں اُسے اس سے روکوں تو اندیشہ ہے کہ کہیں عنداللہ معتوب نہ ہو جاؤں اور اگر اُسے اس کی اجازت دے دوں تو ظاہر ہے کہ اس موذی مرض میں مبتلا ہو جانا یقینی ہوگا۔ واضح رہے کہ اس مرض میں مبتلا ہو جانے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ میرے منع کرنے کے باوجود شدید گرمی کے ایام میں وہ حالت حمل اور حالت رضاع میں بھی رمضان کے روزے رکھتی رہی ہے۔ اور اسی وجہ سے بے حد کمزور ہو کر وہ اس بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ اب اس کا کہنا یہ ہے کہ تمام زندگی میں اس سعادت سے محروم رہوں تو خدا کو کیا جواب دوں گی اور ان کی قضا دینے سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکوں گی؟ کیا فدیۂ طعام مسکین ساری زندگی کے روزوں کی تلافی کر سکتا ہے؟ اور اگر مرد کسی وجہ سے دو وقت اپنی بیوی کی طرف سے کسی مسکین کو کھانا نہ کھلا سکے یا اس سے کوتاہی ہو جائے تو اس کا مواخذہ مرد کو ہوگا؟ —— براہِ کرم اس کی وضاحت فرما دیں۔

جواب: پہلے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ پہلے میں خود بھی یہی خیال رکھتا تھا کہ جاہلیت کی حالت میں جو نمازیں قصداً یا غفلت سے چھوڑی گئی ہیں ان کے لیے صرف توبہ کافی ہے اور ان کی قضا واجب نہیں۔ لیکن تحقیق کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر آدمی کافر نہ تھا، صرف جہالت اور غفلت کی بنا پر تارکِ نماز رہا، تو اس کے لیے صرف توبہ کافی نہیں بلکہ پچھلی نمازوں کی قضا بھی کرنی چاہیے۔ ابن تیمیہؒ نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے یہ اصولی بات بیان کی ہے کہ توبہ کے ساتھ سابق کی تلافی اور آئندہ کے لیے اصلاح، دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی گناہ ایسا ہو جس کی تلافی کے امکانات ہی نہ ہوں تو بات دوسری ہے۔ اس صورت میں توبہ اور ندامت و شرمساری کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن جن گناہوں کی

تلافی ممکن ہو، وہاں پر توبہ کے ساتھ تلافی کیے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ مثلاً کسی کا قرض آپ کے ذمہ تھا اور آپ نے مدتوں اسے ادا نہ کیا، تو اب اس گناہ کی معافی صرف توبہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ وہ قرض ادا کرنا بھی اس کے ساتھ ناگزیر ہے۔

رہا یہ سوال کہ سنتیں فرائض کے نقائص میں جو جبر کسر کا کام کرتی ہیں، یہ تو قضائے فوائت کی صورت میں نہ ہو سکے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ قضائے فوائت کا ثواب انشاء اللہ یہ کسر پوری کر دے گا۔ آدمی کا پچھلے گناہ پر نادم ہو کر اس کی تلافی کے لیے کوشش کرنا اپنے اندر ایک زائد ثواب رکھتا ہے۔

بقیہ عمر کتنی رہ گئی ہے، اس کی تو آدمی کو خبر نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس وقت بھی آدمی تلافی مافات شروع کر دے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر فرمائے گا اور اگر تمام مافات کی تلافی کرنے سے پہلے اس کی اجل آجائے تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی یہ کوشش اتنی مقبول ہو گی کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اس کے مافات کو معاف فرما دے گا۔

آپ کی اہلیہ کے معاملے کا جواب یہ ہے کہ اگر طبیب کی رائے یہ ہو کہ اب روزے رکھنا ان کے لیے مہلک ہو گا تو وہ روزے نہ رکھیں اور رمضان کے زمانے میں ایک مسکین کو کھانا کھلاتی رہیں۔ آپ کو اگر ان کی زندگی عزیز ہے تو یہ ایثار آپ کو خود ہی کرنا چاہیے کہ انہیں ایک مسکین کے کھلانے کا خرچ دیتے رہیں۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو چاہے گناہ گار نہ ہوں لیکن اس صورت میں آپ کو بیوی کی جان خطرے میں ڈالنی ہو گی۔

تفہیم القرآن جلد سوم کا ایک حصہ

تفسیر سورۂ نور

(مع نقشہ جغرافیہ وانڈکس)

جسے فائدہ عام کے لیے الگ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اسلامی نظام معاشرت کے متعلق وہ تعلیمات جو مسلمانوں کی اخلاقی و اجتماعی زندگی کے لیے اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پردہ، استیذان، قذف اور زنا سے متعلق قوانینِ شریعت پر مبسوط بحث۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے باہمی ربط و تعلق کی صحیح نوعیت اور اس ضمن میں جدید شبہات کا شافی جواب۔ اسلامی قانون اور نظام معاشرت کے متعلق ایسی معلومات جو اردو، انگریزی ہی میں نہیں خود عربی زبان میں بھی کہیں یکجا مرتب نہیں ملتیں۔

کاغذ کرنافلی سفید مجلد عام ہدیہ تین روپے چار آنے
" ولایتی " " " چار روپے ۸/
" " سفید مجلد ڈسٹ کور " چھ روپے
محصول ڈاک آٹھ آنے علاوہ

ناشر تفہیم القرآن

مکتبۂ تعمیرِ انسانیت موچی دروازہ لاہور

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی جلیل الشان تالیف

تفہیم القرآن

جلد اوّل (طبع سوم) سورۂ فاتحہ — سورہ الانعام سائز ۲۹×۲۲/۸ ۶۶۴ صفحات ہدیہ قسم عام -/۱۰ اعلیٰ -/۱۵

جلد دوم (طبع دوم) سورہ الاعراف — سورہ بنی اسرائیل " " ۷۲۰ " " ۱۲/- ۱۸/-

قسم اوّل — بائیس روپے بارہ آنے۔ (محصول ڈاک ایک روپیہ چار آنے)

مکتبۂ تعمیرِ انسانیت موچی دروازہ لاہور سے طلب فرمائیں

خــــالی صفحــــه

رسالہ دینیات

از

سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ رسالہ ہائی سکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے لکھا گیا ہے ۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے ۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے ۔ اس میں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں ۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں ۔ نیز غیر مسلم بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں ۔ کیونکہ یہ رسالہ ان کو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے ۔

ضخامت (۲۰×۳۰/۱۶) ۱۷۹ صفحات ۔ قیمت ۲/۱۲ روپیہ

ہر طرح کی دینی ۔ علمی ۔ اخلاقی ۔ اصلاحی ۔ اسلامی ۔ معاشرتی اور معاشی کتابیں ملنے کا پتہ

ادارۂ ترجمان القرآن ۔ اچھرہ ۔ لاہور

مطبوعہ پاکستان پرنٹنگ ورکس ۔ لاہور